

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188348

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۸

Accession No.

۲۳۱۸

Author

ابراہیم الدین صدیقی

۳۱۸

Title

اسلام و ہند اور ان کی اقسام

This book should be returned on or before the date last marked below.

سلسلہ مطبوعات انجمن طلیسانین ملکہ

پریم حسد

اور

اُن کی افسانہ نگاری

پریم حسد

(از)

محمد اکبر الدین صدیقی، ام، لے (عثمانیہ)

دفتر انجمن طلیسانین عثمانیہ مانع عامہ حیدرآباد دکن انون ۱۵۵۳

فہرست

پیش لفظ

پہلا باب - پریم چند کی مقبولیت اور ان کے متعلق اردو میں ادب
ابتدائی کتابیں ... مقدمہ امتیاز علی تاج ... پریم چند پر و فیس سرور کی
نظر میں ... تاریخ ادب اردو میں پریم چند کا ذکر ... پریم چند کے متعلق
دوقار عظیم انبالوی کی رائے ... ”مجلس“ میں پریم چند کی یاد ... و شمال
بھارت میں پریم چند پر اظہار خیال ... ”افسانہ“ میں پریم چند کا ذکر ...
پریم چند کے متعلق پروفیسر اعجاز حسین کی رائے ... پریم چند کے متعلق جے
نند کمار کی رائے ... ۱۹۱۹ء کی مطبوعات (اردو ادب جنگ عظیم کے بعد)
تاریخ ادب ہندی، نئے ادبی رجحانات، مختصر تاریخ ادب اردو) میں پریم چند کا
ذکر ... پروفیسر آئی احمد سرور کی رائے ... کتابوں کے علاوہ دیگر ملاحظہ
دوسرے باب - حالات زندگی -

پیدائش ... بچپن ... تامل ... تعلیم ... ٹیوشن ... ملازمت ...
ادبی زندگی ... ”سوز وطن“ کی اشاعت ... پریم چند کی علامت ...
کانگریسی سرگرمیاں اور ملازمت سے استعفاء ... فکرو روزگار ... سرسوتی
پریس کا قیام ... بطبع نول کشور سے تعلق ... رسالہ پنس کا اجراء ... پریم چند
اور ہندی ادب ... فلم کمپنی کی ملازمت ... انتقال ... خانگی زندگی ...

ہندی کتابوں سے آمدنی..... اردو کتابوں سے آمدنی..... اخلاق و
 عادات..... بے تعصبی..... برادری..... تصویر کے پریم چند..... ۱۷

تیسرا باب - افسانہ - ارتقا اور فن

افسانہ کیا ہے..... قدیم تخیل..... قدیم افسانوی ادب..... ہندوستان
 میں افسانہ نگاری..... نذیر احمد..... سرشار..... شرر اور سجاد حسین
 محمد علی اور راشد انجیری..... موجودہ افسانہ نگار..... ترقی پسند
 ادب..... افسانہ کی ساخت خارجی پہلو..... افسانہ کی ابتدا اور تہمتا
 داخلی پہلو.....

۳۳

چوتھا باب - پریم چند کے موضوع

پریم چند کا مقصد افسانہ نگاری..... ازدواج بیوگان..... حاکموں کا کردار
 رشتہ ستانی..... دیہاتیوں کا کردار..... بچوں کی نفسیات.....
 خود نوشتہ سوانح افسانوں میں..... عورت کا مرتبہ اور آزادی.....
 شادی کے متعلق پریم چند کا خیال..... راجپوتنیوں کی عظمت..... ۴۷

پانچواں باب - پریم چند کا اسلوب بیان

طرز خطا اور طرز بیان کی نقل..... اپنے اسلوب کے متعلق پریم چند کا خیال
 ابتدائی دور میں شرر و سرشار کا اتباع..... دس سال بعد کا اسلوب بیان
 اکیس سال بعد کا اسلوب..... ہندی الفاظ کی آمیزش.....
 ٹیگوریت..... پریم چند کی تشبیہیں..... پریم چند کی زبان..... ۶۹

چھٹا باب - افسانے کے علاوہ پریم چند کی خدمات

اسرارِ معابد پریم چند کی ناول نگاری..... ہم خرم و ہم ثواب..... جلوہ ایشیا.....
 نرملہ..... بیوہ..... بازار سن..... چوگان ہستی..... پردہ مجاز.....

غبن..... گوشہ عافیت..... میدانِ عمل..... گمراہی..... پریم چند
سوداگر..... مدیر پریم چند..... پریم چند فلمی دنیا میں..... پریم چند فوٹو اننگز

۸۵

کی حیثیت سے..... معلم پریم چند۔

ساتواں باب۔ پریم چند کا اثر اردو افسانہ نگاری پر۔

پریم چند کا موضوع ہندوستانی غلام تھے..... پریم چند کے مقلدین.....

عظیم بیگ چغتائی..... سدرش..... عظیم کریمی..... علی عباس حسینی.....

۹۷

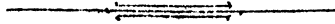
ایم اسلم..... کرشن چندر..... اشک..... بیدی..... قاسمی۔

۱۰۳

فہرست تصانیف پریم چند۔

۱۰۵

اشادہ



پیش لفظ

منشی پریم چند نے اپنے قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ اُردو زبان کی جو قابل قدر خدمت انجام دی ہے اور اُردو ادب میں جو بیش قیمت اضافہ کیا ہے اس کا اقتضا تو یہ ہے کہ ان کے حالات اور تصانیف پر متعدد کتابیں اور مقالے لکھے جاتے۔ منشی جی نے ایک طویل عرصے تک تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے اور ان کی ادبی زندگی کے مختلف دور ہیں اور مختلف تصورات اور مقاصد ان ادوار میں ان کے پیش نظر رہے ہیں اور یہ ان کی کتابوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک بلند مقصد جو شروع سے آخر تک ان کی ادبی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اُردو کے افسانوی ادب میں ملکی اور مقامی رنگ کی جو نسوز ناک کمی ہے وہ دور کر دی جائے اور ہندوستان کے دیہات و قصبات کی زندگی (کھلی ہندستان یہی ہیں) پیش کی جائے تاکہ وہ حقیقی معنوں میں ہندوستانی ادب کہلایا جاسکے۔ وہ اپنی اس پُر خلوص کوشش میں ہر طرح کامیاب ہوئے اور بہت سے افسانہ لکھنے والے ان کی تحریرات سے متاثر ہو کر اس رنگ میں لکھ رہے ہیں۔ ان کی بدولت آج اُردو ادب میں ایسے افسانوں کی کمی نہیں جو ہر طرح ملکی اور عصری افسانے کہے جاسکتے ہیں۔ پریم چند کی سادہ اور علمی زندگی دیکھنے والے کے لیے اپنے اندر بہت دلکشی رکھتی ہے مگر ایک ایسے محسن اُردو پر اُردو میں بہت کم لکھا گیا ہے اور باوجود ان کی خاص و عام میں مقبولیت اور ہر دلچیزی کے ان کی تصانیف پر کوئی قابل لحاظ تنقیدی کتاب نہیں لکھی گئی۔

مولوی کبرالدین صاحب صدیقی نے غالباً پریم چند کی سادہ اور علمی زندگی اور خاصہ عام میں ان کی مقبولیت سے متاثر ہو کر اپنے ام، اے کے مقالے کے لیے ”پریم چند کا انتخاب کیا ہے۔“

لایق مقالہ نگار نے کافی تلاش اور جستجو سے پریم چند کے متعلق جگہ جگہ سے مواد فراہم کیا ہے اور خود ان قصہ انیف کا غائر مطالعہ کر کے ان کے موضوعات، اسلوب بیان اور ارتقائے فن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ نیز اردو کے افسانہ نگاروں کو پریم چند نے کس حد تک متاثر کیا ہے اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مقالہ نگار پریم چند کے مباح ضرور ہیں لیکن پرستار نہیں عام روش کے برخلاف انہوں نے پریم چند کا مطالعہ تقریباً نگار کی بجائے تنقید نگار کی حیثیت سے کیا ہے اور اس لیے یہ مقالہ ایک لائق قدر ادبی کوشش ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے بہت سے امور میں رہبری کرے گا۔

محمد
سید

ام، اے عثمانیہ
لیکچرار اردو

{ سٹی کالج حیدرآباد دکن
جنوری ۱۹۴۵ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلا باب۔ پریم چند کی مقبولیت اور ان کے متعلق اردو میں ادب

ابتدائی کتابیں | ۱۹۰۹ء تک پریم چند سے بہت کم لوگ واقف تھے ۱۹۰۲ء میں جب کہ ان کا ناول (ہم خرما و ہم ثواب) شائع ہوا تو مصنف کی حیثیت سے ان کی ادبی زندگی شروع ہوئی۔ اور وہ رفتہ رفتہ روشناس ہوتے گئے۔ ۱۹۰۹ء میں (سوز وطن) کی اشاعت اور اس پر پریم چند کے خدایان مجاز می کا بگڑنا اور انھیں انتہائی حد تک پریشان کر دینا کچھ تو ان کی شہرت کا بھی باعث ہوا اور ان کے خیالات پر بھی کافی اثر انداز ہوا (جلوہ ایثار) کی اشاعت نے انھیں بہت زیادہ مشہور کر دیا حالانکہ اس سے پہلے وہ کچھ کہانیوں (ہم خرما و ہم ثواب) اور (رد مٹی رانی) کے مصنف بن چکے تھے۔ ابتدائی کہانیوں میں راجپوتوں کی شجاعت اور جان بازی کو بیان کیا گیا تھا اور چونکہ انھوں نے اپنے لیے ایک علیحدہ میدان پیدا کر لیا اس لیے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ (جلوہ ایثار) اور اس کی پیشرو کتابوں نے بہا تما گاندھی۔ موتی لال نہرو۔ اور لاجپت رائے کی تقریروں کا کام کیا اور وہ لوگوں کو ایک نئے طریقے سے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مقدمہ امتیاز علی تاج | ۱۹۲۵ء تک ان کی کہانیوں کی تعداد بھی کافی ہو چکی تھی اور لوگ ان کے نام اور کام سے واقف ہو چکے تھے اس آئنائیں (پریم پیمسی) اور (پریم پیمسی) منصفہ شہود پر آچکی تھیں۔ موزالذکرہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی اس کی طبع دوم پر امتیاز علی تاج نے مقدمہ لکھا۔ یہ پریم چند کے ادبی کارناموں پر پہلی تنقید تھی اس میں انھوں نے پریم چند کے قصوں کی

زندگی کو بہت سے زاویوں سے دیکھا گیا اپنے عروج کے دنوں میں کچھ اصلاح پسند ہو گئے تھے اور ان کا یہ رجحان ان کے ناولوں سے بدرجہہ غایت نمایاں ہے۔ اور اگرچہ بہا اوقات وہ کسی معاشرتی برائی یا اصلاحی مقصد کو مرکز بنا کر اس کے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے تھے اور ان کا یہ اسلوب زمانہ قبل از جنگ کے معاشرتی اور اقتصادی نظام اور اس دور کی قدروں سے خوب مطابقت رکھتا تھا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ آج کل کے نفسیاتی افسانے کی بنیاد بھی انہی نے رکھی اور افسانے میں کردار کی تعمیر کی اہمیت کو بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی محسوس کیا۔ لے

پروفیسر آں احمد سرور کا بھی خیال بالکل صحیح ہے وہ لکھتے ہیں۔

”بیسویں صدی کے نئے نئے انقلابات اور پریم چند کے اثر نے افسانہ نگاری میں نت نئے رجحانات پیدا کر دیے اب افسانہ نگاری صرف تفریح نہ رہی وہ فریاد کی ایک نئی بن گئی“ لے

اس طرح انہوں نے افسانہ نگاری کو فریاد کی لئے بنا دیا اور روز بروز مقبول انا م ہوتے گئے تاج صاحب کے مقدمے لوگوں کی افسانہ خوانی کی آتش شوق کو بھڑکا یا۔ اردو ادب میں یہ پہلی کوشش تھی کہ پریم چند کے کارناموں پر فنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی گئی۔ پریم چند پروفیسر سروری کی نظر میں دنیا کے افسانہ اور کردار اور افسانہ کا مرتبہ اپنے فن پر اردو زبان میں پہلی کتابیں ہونے کی حیثیت سے سید بلند ہے پروفیسر سروری پریم چند کے متعلق فرماتے ہیں۔

”پریم چند پہلے قصہ نگار ہیں جنہوں نے مختصر قصوں کو اعلیٰ پایا یہ پرہینچا یا۔ اردو مختصر قصوں کے لیے انہوں نے وہی کام کیا جو شرر نے ناول یا اسٹیون سن نے انگریزی مختصر قصوں کے لیے کیا۔ گھر شرر یا اسٹیون سن کو ناول یا مختصر قصوں کا موجد نہیں تسلیم کیا جاتا۔ اسی طرح پریم چند بھی اردو مختصر قصہ نگاری کے موجد نہیں کہے جاسکتے۔ لیکن ان مختصر قصہ نگاری میں اختصا صی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ان کے قصے ہندوستانی زندگی کے

پاکیزہ اور ماؤس مرتھے پیش کرتے ہیں۔ ان کا جزئیہ قصہ ہمیشہ طریقے سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ منشی پریم چند کے جزئیہ قصوں کے پڑھنے سے اثر تمام بدن میں بجلی کی طرح دوڑ جاتا ہے لیکن طبعیہ اثر اس پایہ کا نہیں۔ منشی پریم چند کے قصوں میں اختصار الفاظ کی خصوصیت حیرت انگیز ہے۔ ان کے قصے میں مقامی رنگ کی بہترین جھلکیں موجود ہیں۔“

(دنیاے افسانہ) کی اشاعت کے بعد بھی پریم چند کو خیالات تک زندہ رہنے کے اسلوب بیان میں پختگی آتی گئی اور ان کے خیالات میں بلندی اور حقیقت پسندی پیدا ہوتی گئی۔ تاریخ ادب اردو میں پریم چند کا ذکر (دنیاے افسانہ) کے بعد رام بابو سکسینہ کی تاریخ کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ یہ ادب اردو کی موجودہ تاریخوں میں سب سے زیادہ مستند کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ پریم چند کے متعلق لکھا ہے۔

”میدان قصہ گوئی کے شہسوار ہیں۔۔۔۔۔ جھوٹے جھوٹے قصے لکھنے میں بد طولی رکھتے ہیں اور حتیٰ یہ ہے کہ آپ کے اس قسم کے افسانے اس زمانے کے کثیر العدد انعام نہاد ناولوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو سچے گینوں کو جھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ آپ کو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستانی ادب کے موبہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں بیان کیے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں پاس نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں سجد آمد اور زور معلوم ہوتا ہے۔ لطیف استعارات اور تشبیہوں سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔۔۔۔۔ آپ نفسیات کے بھی پورے ماہر ہیں آپ کے کلام میں ظرافت اور کہیں رد وہی رنگ دکھاتا ہے جیسے کہ دھوپ اور چھاؤں۔ آپ کے کیرکٹر نہایت مخصوص جیسی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔“

پریم چند کے متعلق وقار عظیم ناولی کی رائے | ۱۹۳۵ء میں وقار عظیم ناولی نے (افسانہ نگاری) اور

(ہمارے افسانے) دو کتابیں شائع کیں۔ اصل میں یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں پہلی کتاب فن افسانہ پر ہے اور دوسری اردو افسانوں اور افسانہ نگاروں پر۔ پہلی کتاب جو فن افسانہ نگاری پر لکھی گئی ہے اس میں لوازم افسانہ بتلائے گئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر لازم افسانہ کے ساتھ وقار عظیم صاحب نے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ان میں پریم چند۔ سدرشن۔ نیاز اور مجنوں کے افسانوں سے زیادہ مثالیں دی گئی ہیں۔ مثال کے لیے اس کتاب کا ایک باب (افسانہ کی سرخی) ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ افسانے کے عنوانات مختلف طور پر قائم کیے جاسکتے ہیں۔ پریم چند کے متعلق لکھا ہے۔

”پہلی چیز جس پر افسانہ کی بنیاد ہے وہ تحریک ہے اور پریم چند کے اکثر افسانوں کی سرخیاں مثلاً (آہ بے کس) (مامتا) (اندھیر) (کرموں کا پھیل) (غیرت کی کتاب) (تریاجرت) (خون سفید) وغیرہ افسانے بڑھنے کے بعد اگر ہم ان سرخیوں پر نظر ڈالیں گے تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ واقعی یہ سرخی موجودہ افسانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے“

دوسری چیز وہ سرخیاں جہاں کسی مخصوص صفت کا ذکر ہے زیادہ نمایاں اور تصور زاہیں مثلاً بڑے گھر کی بیٹی۔ نمک کا داروغہ وغیرہ۔

چوتھے باب ”افسانے کی فنی ترتیب“ میں رقم طراز ہیں کہ۔

”ترتیب کا بہترین مواد اکثر افسانہ نگاروں کے نزدیک مقامی رنگ ہے اور اس لیے ہر زبان کے اچھے اچھے افسانہ نگار اپنے لیے کسی نہ کسی خاص مقامی خصوصیت کو مخصوص کر لیتے ہیں اور اپنے افسانوں کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔ اردو میں پریم چند اور ان کا اثر قبول کرنے والوں کے افسانے اس رنگ کی بہتر سے بہتر مثالیں پیش کر سکتے ہیں.....“

وہ فطرت انسانی کی شیریں اور تلخ حقیقتوں پر عبور رکھتے ہیں انھیں نفسیات نے عام انسانی فطرت کی نازک لطافتوں سے آگاہ کر رکھا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ انسانی فطرت کی کونسی رگ کس وقت چھیڑنی چاہئے اور کس رگ کا کس وقت چھیڑا جانا خطرناک اور

خلافتِ فطرت ہے۔ اس کی صد ہا مثالیں ہیں پریم چند کے افسانوں میں نہیں گی جن میں سے اکثر میں انہوں نے دیہاتی زندگی کو اپنا پس منظر بنایا ہے اور اپنے افسانے کی بنیاد بھی اسی ترتیب سے رکھی ہے۔“

اس کے بعد تقریباً ہر باب میں وقارِ عظیم صاحب نے پریم چند کے افسانوں سے مثالیں دی ہیں اور ان کی خدمات کو بجا طور پر سراہا ہے۔

ان کی دوسری کتاب (ہمارے افسانے) دو حصوں پر تقسیم کی گئی ہے پہلا حصہ (ہمارے افسانے) ہے اور دوسرا (ہمارے افسانہ نگار) ان میں پریم چند کا نام سرفہرست ہے اور ان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

”پریم چند اور افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں قریب قریب وہ ساری باتیں موجود ہیں جو مختلف حیثیتوں سے افسانے کو بلند بناتی ہیں..... انہوں نے اپنے افسانوں کو ایک نہیں بیسیوں طریقوں سے دلچسپ اور دلکش بنایا ہے اور ہر مذاق کا آدمی انہیں پسند کرتے پر مجبور ہے۔“

پریم چند کے افسانوں کی خصوصیت | ان کے افسانوں کی پہلی خصوصیت جذبہِ تومی ہے اور اس میں

وہ تمام افسانے آجاتے ہیں جو ہندوستان کی عظمت و جلال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں راجپوتوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے افسانے نہایت بلند پایا ہیں۔

دوسری خصوصیت ان کا مقامی رنگ ہے اور اس میں وہ افسانے شامل ہیں جو دیہاتی اور ہندو گھرانوں کی زندگی سے متعلق ہیں..... دیہاتیوں کے مصائب کو ایسے طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ ہم پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اس کا ایک سبب یہ ہے کہ پریم چند دیہات کی حسین فضاؤں کو ہماری نگاہوں کے سامنے جمادیتے ہیں اور جب ہمیں دلچسپی ہو جاتی ہے تو پھر ان کے آفات کا دکھنا سنا کر ہماری آنکھوں سے گزرگا جتنا بہادیتے ہیں۔

تیسری خصوصیت فطرت انسانی کا گہرا مطالعہ ہے۔ افسانہ نگار نفسیات سے زیادہ کام لے کر افسانہ کو بلند معیار پر لے جاتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے نفسیاتی مطالعہ اور شاہراہ سے بھرے پڑے ہیں اس سے پریم چند نے اس قدر کام لیا ہے کہ اپنے اسٹائل میں اپنے طرز بیان میں اور اپنے جملوں میں جہاں تشبیہات دیتے ہیں تو انہیں نفسیاتی محسوسات کو کام میں لاتے ہیں۔

ان کے کردار زیادہ تر مثالی ہوتے ہیں جن کے اعمال ہمارے لیے نمونہ بن سکتے ہیں وہ اپنے کرداروں کو عموماً ابتدا ہی میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور ان کی خصوصیات سے بھی واقف کر دیتے ہیں۔

ان کے افسانوں کا خاص حسن ہول کے خلاف ان کی تفصیلات ہی میں ہے۔ آخر میں وقار عظیم صاحب نے ان کی زبان کے متعلق اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے۔

”وہ ہر چیز کو نہایت آسان اور پر لطف زبان میں بیان کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ہندی اور فارسی کے لفظوں اور ترکیبوں کا شیریں امتزاج تشبیہوں اور استعاروں کی عمومیت اور نفسیاتی عالمگیریت۔ الفاظ کا بر محل استعمال۔ چیزیں پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔۔۔۔۔ ان کا طرز بیان سنگتہ ہے اور جا بجا مبالغہ کے نازک اور چھوٹے ٹکڑے خوب صورت نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے معلوم ہوتے ہیں۔

پریم چند اور ان کے افسانوں کے متعلق مبالغہ نہ معلوم ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند کے افسانے ہندوستان کی سرزمین کی بہترین پیداوار ہیں۔“

ادارہ رسالہ (زمانہ) نے (یادگار پریم چند) کے نام سے ۱۹۳۶ء میں ایک خاص نمبر نکالا اس کو چھوڑ کر اور کوئی ایسی کتاب اردو میں نہیں کہ پریم چند کے متعلق تفصیلی مواد دے سکے (یادگار پریم چند) بہت ضخیم ہے اور پریم چند کے متعلق شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو چھوٹ گئی ہو (پریم سوگ) حسام الدخاں غوری سکندر آبادی نے شائع کی اس میں مصنف نے پریم چند کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں کا زیادہ خصوصی تعلقات پر زور دیا ہے۔ اس سے پریم چند کی فلمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور یہ کتاب پریم چند انجمن کے لیے

نذر عقیدت کا کام دے سکتی ہے۔

”مجلس“ میں پریم چند کی یاد | ۳۲ - ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج میں محفل ادب منعقد ہوتی تھی اس میں مقالے پڑھے جاتے اور علمی مباحث پر گفتگو ہوتی اس ”مجلس اُردو“ کے اراکین نے اپنے مقالوں کو ”مجلس“ کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے ”مجلس اردو“ کے اراکین جو وہ زمانے کے مشہور انشا پرداز اور مصنفین ہیں۔ اس ”مجلس اردو“ میں آغا عبد الحمید صاحب نے اپنا مقالہ ”پریم چند“ سنایا تھا۔ جو اس کتاب میں سب سے پہلے شائع ہوا ہے۔

آغا صاحب نے چار ناولوں پر تنقید کی ہے اور افسانوں پر عام رائے کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ اس رائے سے پروفیسر آل احمد سرور بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مضمون کی تیاری میں اس کتاب سے بھی مدد لی ہے۔ چونکہ اکثر حلقے مشترک ہیں اس لیے ہم نے پروفیسر صاحب موصوف کی کتاب سے اقتباس لے لیا ہے جو آگے کہیں لڑیگا۔ آغا صاحب پریم چند کے متعلق فرماتے ہیں -

”پریم چند ایک اعلیٰ درجہ کے قصہ گو اور میسوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔ غالباً وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنے گرد و پیش کو ایک عینس اور بے تعصب نظر سے دیکھا اور اپنی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ یقیناً پہلے ناول نویس ہیں جنہوں نے انسانی دل کو بغور اور ہمدردانہ دیکھا اور اس کی حرکت کا تجربہ کیا ہے“

گو پریم چند ایک حقیقت نگار ہیں مگر ان کی حقیقت نگاری بے جان جزوئی ہو کر نہیں رہ جاتی وہ اپنے شاعرانہ طرز بیان سے اس میں ایک رومانی ماحول پیدا کر دیتے ہیں..... پریم چند کی حقیقت نگاری ان کے ناولوں کو تاریخی سندت کی اہمیت بخشی ہے۔

پریم چند قصہ کی ترتیب میں بہت دسترس نہیں رکھتے۔ وہ پلاٹ کی تعمیر فرماری

طرح نہیں کر سکتے بناوٹ کے لحاظ سے ان کے ناولوں میں کوئی تنوع اور جدت نہیں ان کے ناول بہت غیر مربوط اور غیر منظم ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ مختصر افسانوں کا سلسلہ بن کر رہ جاتے۔ ۱۷

وہ زندگی کو ایک نقاد کی طرح دیکھتے ہیں اور ان کے ناول صحیح معنوں میں زندگی کی تنقید ہیں لیکن وہ یاس پرست اور تباہ کن نقاد نہیں زندگی پر جو سوال اٹھاتے ہیں اس کو گناگنا لڑوڑی کی طرح وہیں نہیں چھوڑ دیتے کہ پڑھنے والے کو خود اس کا جواب تلاش کرنا پڑے بلکہ جواب کے متعلق کچھ اشارے بھی کر دیتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پریم چند نے زندگی کو سمجھنے اس کے معنی ڈھونڈنے اور اس کا نظام جاننے کے لیے ایک زبردست کوشش کی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کوشش بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ زندگی کو دیکھ کر اس پر سوال کرنے کی ہمت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ ۱۷

”وشال بھارت میں پریم چند پر اظہار خیال“ | ۱۹۳۶ء میں ”وشال بھارت“ کے ہندی رسالے میں ہندی کے افسانہ نگاروں پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے اس مضمون کا خلاصہ اردو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں چھپا ہے۔ پریم چند کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انھوں نے۔

”ہندی ادب کو بہت متاثر کیا ہے اور ایک عرصہ تک یہ اثر باقی رہے گا وہ موجودہ دور کے سب سے زیادہ مقبول ترین مصنف ہیں۔ پریم چند بے زبان عوام کے ترجمان ہیں۔ کسان کے جذبات۔ حالات اور خیالات کی اتنی صحیح تصویر ہندوستان کے کسی مصنف نے اب تک نہیں پیش کی۔“

✓ ہندوستان کے تین سب سے بالکمال افسانہ نویس ٹیگور۔ شرمت چند اور پریم چند زندگی کے تین مختلف شعبوں کے مالک ہیں۔ ٹیگور نفس کی ایک ایک باریکی کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ شرمت چند گھر کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور اس میدان میں اس کا کوئی ہمسر نہیں اور جب انسان اپنی شخصیت کو کھو کر گھر سے باہر قدم رکھتا اور بیسٹر میں مل جل جاتا ہے تو پریم چند کا دائرہ شروع ہوتا ہے۔

”افسانہ“ میں پریم چند کا ذکر | ان کتابوں کے بعد ۱۹۳۷ء میں اور تین کتابیں پروفیسر مجنوں

گورکھیوری کی کتاب (افسانہ) صغیر احمد جان کی (تنویر ادب) اور علی حسنین زریبا کا مقالہ (اردو ادب بیسویں صدی میں) شائع ہوئیں۔

مجموع کی کتاب انگریزی افسانوی ادب کی مختصر تاریخ بھی کہی جاسکتی ہے۔ جس میں روس۔ فرانس۔ امریکہ۔ اور انگلستان۔ کے سب ہی ادیب شامل ہیں۔ پروفیسر جموں نے اپنی کتاب کو ختم کرتے ہوئے اردو افسانہ نگاروں پر اظہار خیال کیا ہے۔ پریم چند کے متعلق وہ ایک جامع اور مختصر رائے پیش کرتے ہیں۔

”پریم چند ان افسانہ نگاروں میں ہیں جن کا معترف شبلی جیسا انشا پر دا ز رہ چکا ہے پریم چند فطرت کی طرف سے فسانہ نگاری کا فن لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے اپنا موضوع ہندوستان کے طبقہ عوام کو رکھا ہے۔ پریم چند کبھی مکمل زندگی کا نقشہ نہیں پیش کرتے ان کے افسانوں کے اجزائے ترکیبی چند چھوٹے چھوٹے گرد لکش اور بصیرت افروز واقعات ہوتے ہیں۔ پریم چند کا مطلع نظر بڑی حد تک خارجی یا تمثیلی ہوتا ہے ان کے افراد قصہ اپنے حرکات و سکنات اور بات چیت سے خود اپنے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے مزاج میں ایک انفرادی خصوصیت ہوتی ہے جو کسی دوسرے افسانہ نگار میں نہیں پائی جاتی۔۔۔۔۔ پریم چند کا اسلوب بیان ان کا اپنا ہے جو نہایت سادہ بے تکلف گروہل بند ہوتا ہے“

صغیر احمد جان صاحب نے تاج صاحب کے مقدمہ (پریم ہتیسسی) دووم سے مواد لیا ہے لیکن آخر میں ایک بات لکھتے ہیں۔

”اگرچہ منشی صاحب مختصر افسانوں کے بانی ہیں لیکن ابتدا ہی سے آپ نے اس فن میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ اب تک کوئی اور افسانہ نگار آپ کے مقابل میں پیش نہیں کیا جاسکتا“

علی حسنین زریبا نے اپنے مقالے میں تاج صاحب کے الفاظ نقل کر دیے ہیں۔
پریم چند کے متعلق پروفیسر عجاز حسین کی رائے | ۴۰ | ۱۹۴۰ء میں ”مختصر تاریخ ادب اردو“ دوسری دفعہ کچھ

اضافہ کے ساتھ شایع ہوئی۔ اس میں تحریر ہے کہ۔

”پریم چند کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کبھی ایک لمحہ کے لیے یہ نہیں خیال ہو سکتا کہ ہم ان لوگوں کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو ہم میں سے نہیں ہیں وہی روزمرہ زندگی وہی صبح و شام جس سے ہم کو روز دو چار ہونا پڑتا ہے ان کے افسانے دلچسپ مواد ہیں۔ جس عام زندگی کو ہم خشک اور اتنی سادی سمجھتے ہیں کہ دلکشی کا شاید کوئی عنصر نہ ہو۔ اسی کو پریم چند اپنے انداز بیان سے بغیر تصنع کے انہی پر لطف بنا کر افسانے میں دکھا دیتے ہیں کہ سر تا پا دلکش ہو جاتی ہے۔

آپ کے رواداد افسانہ کا مخزن دیہات ہے : ہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی۔ سیرت سچائی اور ایسا انداز اور کبھی کبھی بعضوں کی بے ایمانی۔ چالاکائی فتنہ پرانی کا نقشہ پریم چند کے افسانوں کی جان و مال ہے۔۔۔۔۔ ہر چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔۔ پریم چند کے افسانے انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے افسانوں میں مکالمہ نہایت مہتمم بالشان خصوصیت ہے۔۔۔۔۔ منشی جی کی زبان نہایت شستہ اور رواں ہے۔ سادگی اس کا جوہر ہے یوں تو فارسی دہندی کے الفاظ عام طور سے وہ لاتے ہیں مگر اپنا مطلب نکالنے کے لیے بعض وقت ایسے ہی ہندی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے۔۔۔۔۔ دوسرے ایڈیشن میں اعجاز صاحب نے اس ایک فقرہ کا اضافہ فرمایا ہے۔

”اپنی زندگی کے آخری دور میں منشی جی کے خیالات اور اس کے ساتھ ان کے آرٹ میں البتہ ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔۔۔۔۔ ادب کے ترقی پسند مسلک سے وہ اپنے کو وابستہ کر دیتے ہیں ہندوستانی پس منظر کو قائم رکھتے ہوئے ان کے افسانے اور ناولوں میں ہمہ گیری بڑھ جاتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات ان کے افسانے (کفن) میں بیک وقت مرکوز ہو گئی ہیں لہذا اس کو ہم منشی جی کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ اور غالباً یہ اس لیے اتنا پسند کیا گیا کہ آج دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے لاکھ بقیں وہی کہی ہیں جو ہم دوسرے اور حضرت کی آرا میں نقل کر آئے ہیں صاحب موصوف نے ان کی دو خصوصیتیں بتلائی ہیں ایک جذبہ قومی دوسرا مقامی رنگ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

”تفصیلات کا ذکر عموماً افسانے کے لیے عیب ہوتا ہے اس کی بجائے تصور آفرینی سے مدد لی جائی کرتی ہے۔ لیکن پریم چند جو نئیات اور تفصیلات ہی کو حسن بناتے ہیں۔ یہ صحیح کہ ان کے افسانوں میں رومان کی کمی ہے لیکن پریم چند جس زندگی کا نقاش تھا اس کے لیے رومان کا مفسر بننا قدرے دشوار تھا تاہم رومان کا کامل نقد ان نہیں“

دوسری کتاب ”تاریخ ادب ہندی“ ہے علوی صاحب نے ان کی ناول نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ہندی ناول نگاری میں شاندار دور کی ابتدا کی ان کی کامیابی کا راز خود ان کی حسب ذیل خصوصیات میں ہے۔

۱۔ سماجی زندگی کی مصوری اور اس کی خرابیوں کو دور کرنا۔

۲۔ دیہاتیوں کے دکھ سکھ کا احساس کرنا۔

۳۔ انسان کی نفسیاتی تصویر کشی و اصلاح۔

۴۔ طنز و تشبیہ کے عوض میٹھی میٹھی چٹکیاں لینا۔

۵۔ حقایق نگاری۔

۶۔ بیان کی روانی اور مولانا شمس کا رنگ اختیار کرنا۔

یہ وہ خاص موضوعات ہیں جو پریم چند کی شہرت اور ان کی تصنیفات کی جان ہیں۔ علوی صاحب نے پریم چند کے افسانوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا بلکہ ہندی کی ساری افسانہ نگاری کے لیے صرف ایک صفحے میں اشارے دیدیے اور چار پانچ صفحے میں افسانے کی

مرز تحریر کے نمونے۔ اس سے نہ تو پریم چند کے افسانوں ہی پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ان کے متعلق ہم کوئی اور مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ ہندی زبان میں پریم چند کے ناولوں کے متعلق ایک کتاب شایع ہوئی ہے اس کا نام ”پریم چند کی اپنی اس کلا ہے ہمیں ”گنگووان“ کے علاوہ باقی سب ناولوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

”نئے ادبی رجحانات“ کو مصنف نے ”مختصر تاریخ ادب اردو“ کی اشاعت کے دوران بعد شایع کیا اس لیے ہمیں پریم چند کے متعلق کوئی نئی چیز نہیں ملتی اس میں بھی اسی ایک جملے کی تشریح کی گئی ہے کہ زمانہ حال میں افسانہ کا موضوع سماج ہے۔ ہندوستانی سماج میں بہا توں کی اکثریت ہے غریب زیادہ ہیں اور انہیں کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے ان کے حالات لکھنے میں پریم چند پیش پیش رہے۔ اور ان کی زندگی ہی سے افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا گروہ ان کی تقلید کرنے لگا جن میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شریک ہیں یہ لوگ پریم چند کے پیام اور ان کے خیالات کی نہایت دلاویز اور دلچسپ انداز میں اشاعت کر رہے ہیں۔ ان کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔

پروفیسر آل احمد سرور کی رائے | اس سلسلے کی آخری کڑی پروفیسر آل احمد سرور کی کتاب ”تنقیدی اشارے“ ہے۔ ناول نگاری کے سلسلے میں صاحب موصوف نے ندیر احمد سے مرزا رسوا تک تمام ناول نگاروں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان سب کے ناولوں کے متعلق رائے دینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

”یہاں تک کوئی ایسا نہیں ہوا جسے اول درجہ کا ناول نویس کہا جاسکتا لیکن عین حالت انتظار میں اس برادری میں پریم چند کا داخل ہونا ہے جو اردو ناول کو بلندی بخشت اور گہرائی عطا کرتے ہیں۔ پریم چند صرف مختصر افسانے لکھنے ہی میں کمال نہیں رکھتے بلکہ وہ بہت بڑے ناول نویس بھی ہیں۔ بازار حسن۔ چوگان مہنگی گوشہ عافیت۔ پردہ بجا۔ زلا۔ غبن۔ میدان عمل۔ اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں کہوں گا: چوگان بستی، اردو کا بہترین ناول ہے۔ اب تک

جتنے ناول نگار گذرے وہ صرف زندگی کے ایک گوشے کی تصویر بنانے پر قانع تھے۔ پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کائنات۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے فہم نواز درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران، توران کے افسانے نہیں لکھتے۔ وہ ہمیں کے مال سے اپنی دکان بساتے سجاتے ہیں۔ مقامی رنگ مقامی خصوصیات ان کے یہاں اول سے آخر تک محسوس ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت کے بہت بڑے نباض اور نفسیات کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ ان کا مشاہدہ تیز قوی ہے۔ انہیں کرداروں کا پیدا کرنا اور انہیں بڑھنے چلنے پھولنے کا موقع دینا انہیں خوب آتا ہے۔ ان کی حقیقی نگاری میں شعریت زری ملتی ہے اور ایک بے تابی۔ ایک آوارہ بگھی ٹپکتی ہے جو آرنلڈ مینٹ کی یاد دلاتی ہے وہ شاعر بھی ہیں فلسفی بھی۔ ان کا ایک خاص تصور حیات ہے وہ غریبوں اور مظلوموں کے بڑے ہمدرد ہیں۔ کسانوں کے جذبات اور وہیاتی زندگی کے موقعے ان کے یہاں بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ بجا عزت اور بیماری۔ رسم و رواج کا بھوت۔ دولت کی غلط تقسیم۔ مذہب کے نام پر انسانیت کا خون پریم چند سے دیکھا نہیں جاتا اس کے لیے انہوں نے بڑے تیز تیز نشتر تیار کیے ہیں پریم چند کا خیال یہ ہے کہ ”انسان کی فطرت نہ بالکل سفید ہوتی ہے نہ بالکل سیاہ اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے اگر حالات گردوش اس کے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان۔ وہ حالات مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہے۔“ مگر پریم چند اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہماری سیرت ہی ہماری تقدیر ہے۔ پریم چند ایک بہت بڑے تمدنی نقاد ہیں وہ زندگی کی بھول چھلیاں دیکھ کر مایوس نہیں ہوتے بلکہ اس میں سے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مصلحتی کوششوں کو بعض انقلاب پرست اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ پریم چند اس خلیج کو پاٹنا نہیں چاہتے جو امیر و غریب کے درمیان ہے اسے کم کرنا کافی سمجھتے ہیں لیکن اس دور میں یہ بھی کچھ کم غنیمت نہیں۔ سورواس۔ سمن۔ دنے۔ نرطا اور گمان شکر ان کے غیر فانی کردار ہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں افراد کی فتح و شکست نہیں ہوتی بلکہ گروہ یا مقصد کی فتح یا شکست ہوتی ہے پریم چند کی زبان ناہموار ہے۔ فارسی کے فقروں کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ہندی لکھتے لکھتے فارسی پر اتر آتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کا طرز سادہ عام فہم اور زور ہے۔ سادگی میں جوش پیدا کرنا ان کا کمال ہے۔

ان کے بعد اب تک کوئی اور اس پایہ کا ناول نگار نہیں پیدا ہوا ہے۔
پریم چند کی افسانہ نگاری کے متعلق پروفیسر موصوف کا یہ خیال ہے۔

”پریم چند جو درجنوں لازوال کہانیوں کے خالق ہیں افسانہ نویسی کے گرسے پوری طرح واقف نہ تھے وہ قصے کی ترتیب کا بہت اچھا سلیقہ نہ رکھتے تھے اور اکثر ادھر ادھر کی باتوں میں کہانی کا اصل مقصد بھول جاتے تھے۔ مگر چونکہ وہ شدید احساس اور تیز نظر کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی نظر زندگی کے حقائق پر پڑھی جاتی تھی اور وہ براہ راست زندگی سے خام مواد تیار کر لیتے تھے۔ افسانہ نگاری سے انھوں نے تنقید حیات کا کام لیا۔ ان کے اوپر مہتمو آڑ لڑا کا وہ فقرہ صادق ہوتا ہے جو انھوں نے ایک یونانی ڈرامہ نویس کے متعلق کہا تھا۔

پریم چند آخر وقت میں ترقی پسند ادب کے ہمنوا بن گئے تھے اور ”کفن“ ان کے اس دور کی بڑی اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں اس میں ایک لفظ بھی بیکار نہیں ایک نقش بھی دھندلا نہیں۔ شروع سے آخر تک حسیتی واقفیت اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے۔ پریم چند نے ایک دفعہ تو حقیقت کو مردانہ وار دیکھا ہے۔“

کتابوں کے علاوہ دیگر ماخذ | ان کی کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں جتنے رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں کہ اپنے سالانہ نمبر اور افسانہ نمبر وغیرہ شائع کرتے رہتے ہیں۔ بعض رسائل میں افسانہ نگاری پر کوئی مضمون آجاتا ہے تو اس میں بھی پریم چند کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ ایسے رسائل میں ساتی۔ ہمایوں ادبی دنیا۔ عالمگیر۔ شاہکار۔ ادب لطیف۔ اردو۔ زمان۔ ادیب۔ سہیل۔ نگار۔ ایشیا۔ نئی زندگی۔ جامعہ۔ نیا ادب۔ سب رس۔ ہندستانی ادب۔ محاصرہ۔ ندیم کالجوں کے مجلے۔ اور دوسرے ان گنت رسائل ہیں جن میں اگر افسانہ نگاری پر کوئی مضمون شائع ہوا ہے تو اس میں پریم چند کا ذکر کیا گیا ہے حقیقت تو یہ ہے اردو میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری پر کوئی مضمون اس وقت تک مکمل نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ اس میں پریم چند کی خدمات کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور اس طرح اردو ادب کی کوئی تاریخ بھی اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک کہ اس میں پریم چند کا نام نہ آئے۔“

دوسرا باب - حالات زندگی

پیدائش | منشی پریم چند کے والد عجائب لال پانڈے پور (بنارس) کے قریب ایک چھوٹے سے موضع ڈھوا لمہی میں رہتے تھے۔ داہم المریض بیوی اور ایک لڑکی ان کے خاندان کے افراد تھے ۱۸۸۱ء ۱۹۳۷ء سمیت میں ان ارکان میں ایک اور لڑکے کا اضافہ ہوا۔ عجائب لال نے اپنے بیٹے کا نام دھنپت رائے رکھا۔ اس نے دھن تو اتنا نہ پایا جتنا کہ نام اور اس نام کے جاننے والے بھی بہت کم ہیں۔ آج اس دھنی کو سب پریم چند ہی پکارتے ہیں۔

بچپن | عجائب لال بیس روپیے ماہوار کے منشی ڈاک خانہ تھے اور انتقال کے وقت تک انھیں چالیس روپے کی ترقی مل گئی تھی ساتھ ہی ساتھ افراد خاندان میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور وہ تنگی تلخی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ غریب تھے لیکن علم کے قدرواں تھے اور اپنے لڑکے کو انہوں نے رواج زمانہ کے مطابق مذہبی اور فارسی کی تعلیم دلائی ابھی پریم چند سات سال کے بھی نہ تھے کہ ان کی والدہ نے انتقال کیا اور والد نے دوسری شادی کر لی۔ اس طرح پریم چند ماتا سے محروم ہو گئے لیکن والد کی شفقت اور تعلیمی ذوق نے انھیں سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا۔

تاہل | ابھی پندرہ سال ہی کے تھے کہ والد نے ان کی شادی رچا دی مگر اس قید کے باوجود وہ نہم تک پہنچ گئے ابھی تک سایہ پدری باقی تھا اور انھیں کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہ تھی لیکن مشیت ایزدی نے انھیں یتیم بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی گھر والوں کی پرورش کا بار بھی ان کے سر پر گیا۔ زیر پرورش لوگوں میں پریم چند، ان کی بیوی، سوتیلی ماں، اور ان کے دو لڑکے گویا پانچ آدمی تھے اور کمانے والا کوئی نہیں۔ آٹا نہ والد کی تیار داری تھی نہ کھین

اور کریا کریم میں صرف ہو گیا اور اب فکر روزگار پریم چند کے سرسوار ہو گئی۔
 تعلیم | لیکن انھیں اپنی تعلیم سے اتنا شغف تھا کہ وہ اس کو چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے ہم
 یہاں انھیں کے الفاظ نقل کرتے ہیں تاکہ ان کے ذوق علم کا اندازہ لگایا جاسکے۔

”مجھے ایم اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا مگر کاری ملازمت اس زمانہ میں ہو
 اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپیہ کی
 کوئی جگہ پا جاتا مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی مگر پاؤں میں نوکھی نہیں اٹل
 دھان کی میڑیاں بڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔“

وہ کونز کالج بنارس میں پڑھتے تھے اور بانس کی پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے
 جایا کرتے تھے بانس کی پھاٹک سے پریم چند کا گھر باج میل دور تھا شام کے وقت چھ بجے
 ٹیوشن سے واپس ہوتے اور رات کے آٹھ بجے گھر آتے اور پھر دوسرے دن آٹھ ساڑھے
 آٹھ بجے صبح گھر سے نکل جاتے اور مسلسل بارہ گھنٹے گھر سے باہر رہتے۔ ان مصیبتوں
 میں کالج کا امتحان درجہ دوم میں کامیاب کیا۔ کونز کالج میں درجہ اول میں کامیاب
 ہونے والوں کی فیس معاف ہوتی تھی اس لیے انھیں درجہ دوم میں کامیاب ہونے سے
 بڑی مایوسی ہوئی مگر ان کی خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھلی گیا اس کے پرنسپل
 رچرڈسن تھے۔ پریم چند ان سے ملے تاکہ واقعات کا اظہار کریں لیکن پرنسپل ادبھی کوئی کسے
 آدمی ہوتے ہیں وہ ایسے طالب علموں سے نہیں ملتے جو فکر روزگار کے بارے اور علم اور
 روٹی دونوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ پریم چند کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور انھیں رچرڈسن نے
 عہدہ دارانہ مخصوص جملہ دھرا دیا مگر میں کالج کی بات نہیں سنتا۔ حالانکہ کالج میں چھپڑ
 کا حکم چلتا ہے وہ صاحب سے ملنے نہیں دیتے۔ غرض پریم چند لوٹ آئے اور سفارشیں

کی تلاتں میں پھرنے لگے۔ غریب کو سفارش بھی مشکل ہی سے ملتی ہے مگر جوئندہ یا بندہ ٹھاکر
 نرائن سنگھ رکن مجلس انتظامیہ ہندو کالج نے ان کی سفارش کر دی اور وہ رقعہ لیے خوشی
 خوشی گھر آئے مگر دو ہفتے تک بیمار رہے اور پرنسپل سے ملنے کا موقع نہ پاسکے۔ جب صحت
 ہوئی تو گئے اور رقعہ دکھایا۔ آزمائشی امتحان کے لیے متعلقہ مدرسین کے پاس بھیجے گئے۔
 انگریزی کے استاد مطمئن ہو گئے مگر۔

”حساب کے پروفیسر بنگالی تھے۔ میں نے اپنا فارم دکھایا۔ نئی درسگاہوں میں عموماً وہی
 طلبہ آتے ہیں جنہیں کہیں جگہ نہیں ملتی یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور
 ناقابل طلبہ بھر پڑے تھے پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا۔ بھوک میں ساگ پات
 سبھی لذیذ معلوم ہوتا ہے مگر اب پیٹ بھر گیا تھا طلبا جن جن کر لیے جاتے تھے پروفیسر
 صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہو گیا فارم پر حساب کے خانہ
 میں ناقابل الطمینان لکھ دیا گیا تھا“

ٹیوشن | اب وہ پرنسپل کے پاس کس منہ سے جاتے ایک وکیل صاحب کے پاس پانچ روپیہ
 کی ٹیوشن کر لی اور یہیں انھیں رہنے کو بھی جگہ مل گئی۔ اب وہ صرف ناول پڑھتے اور
 مطالعہ کرتے رہتے۔ ان کی زندگی مرمر کے جنے جانے کا نام تھی۔ بے روزگاری میں خانگی
 ملازمت کا تھکے کا سہارا اور سارے خاندان کا باران کے لیے عذاب سے کم نہ تھا۔

ملازمت | ۱۸۹۹ء میں ان کی خوش قسمتی کہیے کہ وہ اپنی ایک کتاب پیکوروتی (علم الحساب)
 انتہائی مجبوری کی صورت میں فروخت کرنے کے لیے ایک دوکان پر گئے اور وہیں اسکول کے
 ایک ہیڈ ماسٹر سے ان کی ملاقات ہوئی جس نے انھیں اپنے مدرسہ کی اٹھارہ روپے کی
 جائداد پر مامور کر لیا۔

ادبی زندگی | پیٹ کی فکروں سے نجات ملی تو پریم چند کے قلم میں روایتی پیدا ہوئی اور ۱۹۰۱ء

انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ ٹیکور کی بہت سی کہانیوں کے ترجمے کیے پہلانا دل (ہم خرماد ہم نواب) ۱۹۰۲ء میں اور (پریا) ہندی میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئے۔ وہ ۱۹۰۲ء میں ٹریننگ کالج الہ آباد کی پریپیٹری کلاس میں داخل ہوئے۔ انٹرنس کامیاب امیدوار ایک سال اسی کلاس میں تعلیم پاتے تھے اور دوسرے سال جوئیر کلاس میں ۱۹۰۴ء میں انہوں نے جوئیرسٹریٹیکٹیوٹیم کی سندلی ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور پر تبادلہ ہو گیا۔

”سوز وطن“ کی اشاعت ۱۹۰۷ء سے انھوں نے اپنی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ان کی سب سے پہلی کہانی (دنیا کا سب سے انمول رتن) رسالہ (زمانہ) میں شائع ہوئی اور پھر وہ (زمانہ) کے لیے کہانیاں لکھتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں کانپور سے ہوا با ضلع ہیمیر پور پر تبادلہ ہوا یہاں پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ (سوز وطن) کے نام سے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ پریم چند کی عرفیت نواب تھی اسی مناسبت سے وہ اپنے ادبی کارنامے نواب رائے کے نام سے شائع کرائے تھے۔ چنانچہ (سوز وطن) پر بھی نواب رائے چھپا تھا۔ ان کہانیوں میں وقتی سیاسی رجحانات کا اظہار تھا یعنی صوبہ بنگال کی تقسیم اور ”گرم دل“ کانگریس کے متعلق خاکے تھے۔ یہ پانچویں کہانیاں حب الوطنی کے نظر افروز رنگ سے رنگی ہوئی تھیں۔ لیکن حب وطن کے دوسرے معنی باغیانہ خیالات تھے اس لیے پولیس نے مصنف کی تلاش شروع کی۔ چونکہ یہ مجموعہ انہوں نے نواب رائے کے نام سے شائع کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ اس کتاب پر مطبع کا نام بھی سہواً طبع نہ ہوا تھا اس لیے پولیس پریشان رہی آخر خفیہ پولیس نے پریم چند کو پالیا اس وقت یہ ہیمیر پور ضلع میں ناظر تعلیمات تھے۔ کلکٹر صاحب نے انھیں بلایا اور ایک ایک کہانی کا مطلب پوچھا اور بالآخر کہہ دیا کہ تم نے حکومت کے خلاف لکھ مارا ہے۔

اس لیے اس کا جرمانہ یہ ہے کہ ساری کا پیاں حکومت کے حوالے کر دو۔ اور آئندہ بغیر اجازت کچھ نہ لکھو۔ پریم چند نے حکم کی تعمیل کی۔ تین سو کا پیاں فروخت ہو چکی تھیں باقی سات سو سرکار کے حوالے کیں اور یہ سمجھے کہ ”سستا ہی چھوٹا“ لیکن یہ تو تہید ہی تھی ضلع کے

عہدہ دار تو اس بات پر تل گئے تھے کہ پریم چند کو بغاوت کی سزا دیں مگر ان کی نیکی آڑے آئی اور انسپکٹر آف اسکولس نے انھیں ان مخصوصوں سے نجات دلادی۔ انہوں نے ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا ان کے مضامین انگریزی منظر فارسی اور تاریخ دوز جو وہ تھے۔ ان کے افسانے ”زمانہ“ (کانپور) ”ہمدرد“ (دہلی) اور ”ادیب“ (الہ آباد) میں شایع ہوتے تھے۔ ”ہمدرد“ مولانا محمد علی کا روزنامہ تھا اور انھوں نے پریم چند کو ہر قصہ کا تیس تیس روپے معاوضہ دیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ”جلوہ ایثار“ لکھا یہ آخری کتاب ہے جس پر نواب رائے کا نام لکھا تھا اس کے بعد انہوں نے اس نام کو چھوڑ کر پریم چند رکھ لیا اور کچھ عرصہ تک یہ نام (زمانہ) کے لیے مخصوص رہا۔

پریم چند کی علالت | انھیں جہو با ضلع ہیر پور ہی میں وہ منحوس تحفہ ملا جوان کا عمر سا تھی بن گیا یہ معدے کی شکایت تھی اور تقریباً لا علاج۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں اپنی درخواست سے بستی کے ضلع میں نیپال کی ترانی کے قریب تبادلہ کر لیا۔ مگر اس تبدیل آب و ہوا کا اثر یہ ہوا کہ جہو با میں جو ہمیشہ کا مرض انھیں شروع ہوا تھا اور ترقی کر گیا۔ اور انھیں اپنی صحت کی بہتری کے لیے رخصت یعنی پڑی۔ وہ چھ مہینے علاج کرتے رہے لیکن بے سود۔ آخر پھر بستی میں آٹھیرے اور ۱۹۱۵ء میں دورہ کی ملازمت کی بجائے مدرسہ کی مدرسہ قبول کر لی تاکہ اوسط اور بہتر غذا میسر آسکے۔

۱۹۱۸ء میں اولی مددگاری نارمل اسکول گورکھپور پران کا تبادلہ ہوا اور ہندی کے مشہور ادیب ہما بیر پرشاد پوتدار سے ملاقات ہوئی جن کے مشورہ پر انہوں نے ہندی زبان میں ”نرسوتی“ نرسوتی کے لیے کہانیاں لکھیں۔ ”سیواسدن“ (بازار حسن) اور ”پریم آشرم“ بھی یہیں لکھے گئے۔ بی۔ اے کا امتحان بھی انھوں نے یہیں کامیاب کیا۔ پوتدار جی کے مشورے سے انھوں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن اس سے تو نہ نکل آئی اور پیدل چلنا دو بھر ہو گیا اس لیے پھر علاج چھوڑ دیا۔

کانگریسی سرگرمیاں اور ملازمت سے استعفا اور اس اسکول میں تاریخ خاص طور پر پڑھاتے تھے۔ اس کتاب کا سبق تو چند روزہ منسلک میں ختم کر دیتے اور پھر ایسی باتیں کہتے جو تاریخ میں نہ ہوتیں اور اکثر ایسی تاریخ کے خلاف مولود فراہم کر کے بتلاتے اور کہتے کہ یہ کتابیں قوموں میں نفاق پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ کانگریس کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ جہاں تاگانڈھی اور جواہر لال نہرو دیہات کے دور سے کر رہے تھے۔ اور رعایا زمیندار اور حکومت ان تینوں کو ان کے حقوق سے واقف کر رہے تھے۔ کسانوں کو بے دخل کرنا ان پر ظلم کرنا اور ان کے مال و اسباب کو ضبط کر لینا اب اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ یہ دور عدم اشتراک کے پرچار اور ترک موالات کا تھا۔ کسانوں کا اتحاد حکومت کے عدل میں سیما کی طرح رقص کر رہا تھا۔ ان پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں اور کسانوں کو جن پر بھروسہ تھا انہیں قید کیا جا رہا تھا۔ غرض ہر طرف بد نظمی اور بے اعتمادی نظر آتی تھی۔ جلیا ذوالہ باغ کا واقعہ بھی ہو چکا تھا۔ اسی اثنا میں جہاں تاگانڈھی نے گورکھپور کا دورہ کیا اور دو لاکھ کے عظیم الشان مجمع میں تقریر کی۔ اس تقریر سے متاثر ہو کر پریم چند نے فروری ۱۹۲۱ء میں ملازمت سے استعفا دیدیا۔ اور ایک گاؤں میں جا بسے۔

فکر روزگار | گاؤں میں جانا ان کے لیے صحت کا پروا نہ تھا۔ انھوں نے خلائی سے کیا سجا پائی مرضی مرحمت سے بھی انھیں چھٹکارہ مل گیا۔ وہ وہاں ایک سال گزارنے کے بعد لالچ ۱۹۲۲ء میں بنارس چلے گئے اور بیٹے بھر کے بعد کانپور جا کر مارواڑی اسکول کے مدرس ہو گئے۔ مگر ایک سال کے اندر ہی اندر کاشی ناتھ جی منیجر اسکول سے مخالفت ہو گئی اور انھیں اس ملازمت سے بھی دست کش ہونا پڑا۔

ماچ ۱۹۲۳ء میں وہ بنارس چلے گئے اور اپنے وطن میں سکونت اختیار کی۔ کئی ہزار کے صرف سے ایک مکان تعمیر کرایا۔ پھر ہندی ادب کے مشہور سرپرست شیوپرنا داس کی

ایام سے رسالہ (مریاد) لکھے پیر رہے کیونکہ (مریاد) کے سابق مدیر پاپو سمپورن آنند
عدم اشتراک کی تحریک کے سلسلے میں جیل جا چکے تھے۔ جب وہ اپنی سزا کی میعاد ختم کر کے
واپس آئے تو شیوپر شاد جی نے انھیں کاشی وریا پیٹ میں مدرسہ کی جگہ دی۔

سرسوتی پریس کا قیام | ایک سال تک یہاں کام کرنے کے بعد انھوں نے تین آدمیوں کے اشتراک
سے ”سرسوتی پریس“ قائم کیا۔ اس میں انھوں نے اپنے سال سے چار ہزار روپے لگائے
تھے لیکن تجارتی ناتجربہ کاری کی بنا پر نقصان اٹھاتے رہے اور آخر ۱۹۲۵ء میں ہندی
ادب کے دارالاشاعت گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ میں لائبریری اسٹینٹ کی سرروپے ماہوار
کی جائداد قبول کر لی۔

مطبع نول کشور سے تعلق | دس ماہ تک کام کرنے کے بعد بھی گزارہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی
اس لیے اپریل ۱۹۲۶ء میں بنارس آ کر جون ۱۹۲۸ء تک رہے جو لائی ۲۸ء میں دو سو
روپے ماہوار پر (مادھوری) لکھنؤ کی ادارت تبدیل کی اور نومبر ۱۹۳۱ء تک یہیں رہے اور
اپنی بہم جہتی قابلیت سے (مادھوری) کے معیار کو بہت بلند کر دیا۔ ۱۹۵۵ء میں کے ساتھ
مطبع نول کشور کی اردو ہندی کی درسی کتابیں بھی تیار کرتے تھے۔ نیشنل بک سٹورس بہار کو
ملک مطبع کے انتقال پر اسٹیٹ کورٹ کی نگرانی میں آگئی اور مولانا محمد عسکری صاحب
آسی صاحب لکھنؤی اور نشی پریس چند نے نومبر ۱۹۳۱ء میں نول کشور سے اپنا تعلق منقطع
کر لیا۔ اور اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ۱۹۳۳ء تک لکھنؤ میں مقیم رہے اور اس کے بعد
بنارس چلے گئے۔ ۱۹۳۵ء تک سرسوتی پریس کا کام کرتے رہے۔

رسالہ ”ہنس“ کا اجراء | انھوں نے اپنے پریس کے کاروبار کو بڑھانے اور اس کو ترقی دینے
کی امکان بھر کوشش کی۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں (ہنس) جاری کیا مگر جون میں یعنی صرف
چھ مہینے بعد اس سے ایک ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تو بند کر دیا اور چھ مہینے بعد
یہ حکم منسوخ ہو گیا تو جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری کیلیے تیسرے تجربے میں ایک کہانی

”قاتل“ شائع ہوئی جس کی بنا پر ان سے دوبارہ ضمانت طلب کی گئی لیکن مسٹر بینا لال کلکٹر بنارس کی سفارش پر معافی مل گئی اور (ہنس) نکلتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء بھارتیہ سماج تیبہ پر شدت سے اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ جون ۱۹۳۶ء میں سیٹھ گویند داس کے ایک مضمون کی اشاعت کی وجہ سے ضمانت طلب کی گئی۔ جس کی بنا پر اراکین انتظامی کمیٹی نے اس کو بند کر دینے کا اعلان کیا۔ ان کی یہ حرکت پریم چند کو ناگوار گذری اور انہوں نے دوبارہ اس کو اپنی ملکیت میں لے لیا۔ اور باوجود نقصان کے تادم مرگ چلا تے رہے اب بھی شیورانی دیوی اور ان کے ہونہار صاحبزادے مسٹر سری پت رائے کی نگرانی میں (ہنس) پریم چند کی یاد نگاہ بنا ہوا نکل رہا ہے۔

پریم چند اور ہندی ادب | یوں تو پریم چند ابتدا ہی سے ہندی میں لکھتے رہتے تھے لیکن ان کا زیادہ وقت اردو لکھنے میں گذرتا تھا۔ فی زمانہ بھی اردو کے مصنفین کی کتابیں بڑی مشکلوں سے فروخت ہوتی ہیں اور ایک ہزار کے ایڈیشن کی فروخت کے لیے برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہی حال پریم چند کا ہوا۔ وہ ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد ہندی کی طرف زیادہ راغب ہوئے۔ اور ۱۹۲۵ء سے تو اس میں شدت پیدا ہو گئی۔ (مریاداً - ۱۹۲۳ء) (مادھوکا ۱۹۲۸ء) (ہنس ۱۹۳۳ء) اور (جاگرن ۱۹۳۳ء) کی ادارتیں اور اہتمام اس کا ثبوت ہیں۔ موزوں الذکر سہفتہ وار اخبار تھا جو شکر جی دیاس کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔ پریم چند کا خیال تھا کہ اس پرچہ سے مطبع ترقی کریگا۔ مالی امداد ملے گی اور ان کی فکریں دور ہو جائیں گی لیکن اس کے برخلاف دو ہی سال میں انھیں دس ہزار کا خسارہ ہو گیا۔ اور ان کی کمزورتی ٹوٹ گئی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مطبع کے کارکنوں نے بھی ان سے دعا کی اور انہوں نے ”جاگرن“ کو مجبوراً بند کر دیا۔ لیکن اس دس ہزار کے گڑھے کو بھرنے کی فکر سوا ہو گئی۔

فلم کمپنی کی ملازمت اور مجبور ہو کر ”اجنٹا سینٹی ٹون“ بھٹی میں ڈرامہ نویس کی حیثیت سے

ساڑھے سات سو روپے ماہوار پر کام کرنے لگے۔ مگر یہاں انھیں جتنا زیادہ روپیہ ملا اس سے زیادہ ان کے ضمیر کا خون ہوا جو ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ تھپیڑ کے مالک آجرتو ہوتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو آمر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا اور دربار داری ان کے ملازمین کے فریض میں داخل ہو جاتی ہے۔ خواہ کوئی کام اس کی طبیعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ سینا کمپنی کے معاملہ میں اور ماحول سے زیادہ مخرب اخلاق اور ضمیر شکن شاید ہی کوئی دوسرا پیشہ ہو۔

یہاں پریم چند کے فن۔ ان کی زبان اور ان کے کارناموں کو سراہنا تو کجا ان کی تحریروں کی تراش خراش کر کے ان کی صورتیں مسخ کی گئیں۔ ان کے دوا فسانے ڈرامے کی شکل میں پیش کیے گئے۔ جن میں ایک ”مزدور“ تھا اور دوسرا ”نوجیون“ اس سے پہلے ”سیواسن“ (بازار حسن) کو بھی قلمبندی کے لیے خریدا گیا لیکن یہاں بھی ارباب سینما کی وہی آمرانہ لوح کار فرما رہی اور ان کے یہ تینوں ناول جو قلمبندی کے لیے حاصل کیے گئے یا جن کی قلمبندی کی گئی سب کا ناس ہوا اور پریم چند برداشتہ خاطر ہو کر معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے مایچ ۱۹۳۵ء میں بنارس واپس ہو گئے۔ اور سرسوتی پرنس کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔

انتقال | ہو با ضلع بہیر پور کا مرض انہیں تحفظاً ہی چپکا تھا۔ اب بھٹی کے ایک سالہ قیام نے ان کی رہی سہی صحت کو اور بھی خراب کر دیا۔ معدہ کی کمزوری بڑھتی گئی آخر جون ۱۹۳۶ء میں ان کے مرض میں زیادتی ہوئی اور وہ جلندھر کا شکار بنے۔ وہ علاج کے لیے لکھنؤ گئے لیکن مرض میں افاق نہ ہونے سے واپس آگئے اور بنارس میں ہومیوپیتھک علاج شروع ہوا۔ لیکن مرض الموت کا کوئی علاج نہیں۔

۴ اکتوبر کی صبح سے دست آنے شروع ہوئے شام تک کئی دست آئے اور طبیعت بدمحل ہو گئی آخر ۶ اکتوبر کی منوس صبح نے اقلیم افسانہ نگاری کے شہنشاہ کو ہیشہ کی زمینیں

ہم پہلے ہی لکھ آئے ہیں کہ پریم چند کی شادی ان کے والد نے کمسنی ہی میں کر دی تھی۔ ابھی وہ پندرہ سال کے تھے کہ ان جھگڑوں میں آ پھنسے اور صرف ایک سال بعد والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کو یہ شادی راس نہ آئی بیوی سے الگ رہ کر انھوں نے کئی سال گزار دیے لیکن اپنی بیوی کے کفیل وہ خود ہی تھے اور مستقل طور پر ماہانہ انھیں رقم ارسال کر دیا کرتے۔ ابھی یہ بیوی زندہ تھی کہ پریم چند نے شیورانی دیوی نامی ایک بیوہ خاتون سے بیاہ کر لیا وہ کنوارے ضلع فتح پور کی رہنے والی ہیں ان کے والد نے ان کی شادی بہت کم عمری میں کر دی تھی اور وہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی بیوہ ہو گئیں سماج کے رسم و رواج کے خلاف ان کے والد نے نیا جرات آموز اقدام کیا اور پریم چند سے ان کا بیاہ کر دیا۔

شیورانی دیوی کی ادبی خدمات | انھیں ہندی میں معمولی شہرت تھی لیکن شادی کے بعد انھوں نے ایسی استعداد بہم پہنچائی کہ آج ہندی کی شہور افسانہ نگار ہیں اور ان کے ترجمے دیگر زبانوں میں بھی شایع ہوتے ہیں۔ ان کی سولہ کہانیوں کا ایک مجموعہ (ناری ہر دے) اور دوسرا مجموعہ (سیندور کی رکھشا) کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ پریم چند کے ساتھ انھوں نے نہ صرف ادبی کام کیے بلکہ سیاسیات میں بھی علی حصہ لیا۔ لکھنؤ میں بائسکاٹ کے متعلق دہرنا رکھنے کے سلسلے میں انھیں ڈیرٹھ ماہ کی سزا ہوئی۔ پریم چند کی وفات کے بعد بھی وہ قومی اور ادبی خدمات میں سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں۔ ان کے بطن سے ۱۹۱۹ء میں سرستی رائے گو رکھپور میں پیدا ہوئے اور امرت رائے ۱۹۲۲ء میں کانپور میں۔ ایک اور لڑکا بھی گو رکھپور میں پیدا ہوا تھا جس نے بعارضہ حیثیت انتقال کیا۔ انھیں ایک لڑکی بھی ہے۔

خانگی زندگی | والد کی زندگی تک تو انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی لیکن ان کے انتقال کے بعد تو آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔ انھیں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے پانچ روپیہ کا ٹیوشن کرنا پڑا آخر ان کی ملازمت اٹھارہ روپیہ کی حقیر رقم سے

شروع ہوئی۔ اور ان کی ادبی زندگی کی ابتدا کا بھی یہی زمانہ ہے۔ وہ زمانہ کے لیے کہا نیا لکھنے لگے۔

ہندی کتابوں سے آمدنی ان کا پہلا ناول (ہم خرمادہم ثواب) نکلا اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن جو آئیں ضرور بڑھ گئیں۔ اس کے بعد (سوز وطن) شائع کیا اور اس کی جو درگت ہوئی اس کا ذکر اد پر آچکا ہے۔ ہندی میں (پر یا) پہلا ناول تھا اس سے بھی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا دوسرا ناول (سیواسدن) (بازار حسن) لکھا اور کلکتہ پستک ایجنسی نے صرف پہلے ایڈیشن کے لیے ساڑھے چار سو روپے پیش کیے۔

یہ پہلا اتفاق تھا کہ پریم چند کو ادیب ہونے کا احساس ہوا۔ اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی جب انھوں نے (پریم آشرم) گوشہ عافیت لکھ کر دیا تو اسی ایجنسی نے اس کتاب کے لیے تین ہزار روپے دیے۔ تیسرا ناول (نرمل) چاند پریس الہ آباد نے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا اور ۱۹۲۸ء میں (رنگ بھومی) گنگا پستک مال آفس لکھنؤ سے شائع ہوا اور پریم چند کو دو ہزار روپے ملے۔

یہ ان کی پہلی کتاب تھی جو ناگری رسم الخط میں لکھی گئی۔ یہ صورت متحدہ کی اس سال کی بہترین تصنیف سمجھ کر ہندوستانی اکیڈمی نے مصنف کو پانچ سو روپے نذر کیے اس کے بعد (کایا کلپ) لکھ کر انہوں نے اپنے ہی پریس سے شائع کیا اور ناگری پر چارنی سبھا بنارس نے اس کتاب پر دو سو روپے انعام دیا۔ اس کی ۱۹۳۶ء تک پانچ ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ غرض پریم چند جب تک ملازم رہے بہت عسرت میں زندگی گزارا کیے۔ اُردو کے دیگر مصنفین کی طرح وہ بھی مفلس ہی رہے۔ لیکن ہندی ناول اور کتابوں سے ان کو مدد ملتی رہی۔

اُردو کتابوں سے آمدنی انھیں امد و تصانیف سے بہت کم آمدنی ہوئی۔ مولانا محمد علی نے اردو میں ایک ایک کہانی پر تیس تیس روپے دیتے اور یہ غالباً ان کی ایک کہانی کا اُردو

سب سے بڑا معاوضہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی بعض رسالوں میں معاوضہ دیا مگر برائے نام (زنا) سے توجو ہلکے لیا اس لیے کہ وہ گھر کا پرچہ سمجھتے تھے۔

پریم چند نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

”اُردو سے اب تک دو ہزار روپے ملے ہوں گے (چوگان ہستی) اور (کنج عافیت)

دونوں آٹھ سو میں دیدیے کوئی ناشر ہی نہ ملتا تھا۔“

(چوگان ہستی کے متعلق ایک ناقد کی رائے ہے۔

”اگر پریم چند نے ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے

کامیاب افسانہ نویسوں میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ برنٹو کی جسارت۔ رسل کی

آزادی۔ ڈکنس کی عزت نگاری۔ کالزوری کا سا طنز۔ تبسم۔ ڈومر کی نقشہ کشی۔

راشد کی ٹیبیس۔ نظامی کی سادگی۔ نفیسی کی عظمت۔ شرر کا جوش۔ رسوا کی معنویت۔

اور ٹینگور کی لطافتیں اگر ایک جگہ اور پورے تناسب کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس

ناول کی سیر کیجئے شاید یہی وجہ ہے کہ جینی۔ جاپانی۔ مرہٹی۔ جرمنی اور ہندی

سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔

”ورلڈ از اسے تھیٹر“ اور ”لائف از اسے اسٹیج“ ایسے کامیاب ناول بھی

اس کے ساتھ تو لے جائیں تو شاید ہلکے ٹھہریں۔“

اور (گوشہ عافیت) کے متعلق اسی ناقد نے لکھا ہے۔

”زبان نہایت ہوار۔ پیاری۔ لوجیلی۔ اور اتنی ستہری اور مٹھی ہے کہ فارسی

خط میں اردو اور ناگرمی حروف میں ہندی معلوم ہوتی ہے۔“

ان دونوں کتابوں کو اردو کے پبلشر نے صرف آٹھ سو میں لیا اور اب تک اس کے

آٹھ آٹھ ایڈیشن شائع کر دیے۔ ایسی صورت میں پریم چند کی روحانی تکلیفوں کا اندازہ

بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو پبلشروں کی اکثر جگہ شکایت کی ہے

اور پندرنا تھہ اشک کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

جو پہلی دفعہ ۱۹۲۴ء میں صرف تین ہزار شاہج ہوئی دو سال تک نہیں نکل سکی۔ حالانکہ اس وقت تک ان کی شہرت بقول مولوی عبدالرزاق صاحب راشد مرتب (کلیات اقبال) کے کشمیر سے راس کمار سی تک اور گجرات سے بنگال تک پھیل چکی تھی اور پنجاب کا تو بچہ بچیاں واقف تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہت بڑے مفکر اور فلسفی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ پنجاب کے بڑے جلسوں میں شرکت کرتے اور انجمن حمایت الاسلام کے عظیم الشان جلسوں کو چاہتے تو لراتے اور چاہتے تو سناتے تھے۔

بہر حال منشی پریم چند کی زندگی بحر متلاطم تھی۔ یتیم ہونے کے بعد سے مرنے تک انہوں نے آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ ادنیٰ مزہ دور کی طرح دن رات کام کرتے تب کہیں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکتے تھے۔

ایڈیٹر (زمانہ) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”مجھے ان خرخشوں سے اس وقت نجات مل جانی چاہئے تھی تاکہ کسی گوشہ میں باطنینا پڑا ہوا کچھ لکھا پڑھا کرتا۔ مگر یہاں ابھی بال بچے پال رہا ہوں جو کام چالیس کی عمر میں ہونا چاہئے وہ اب پچیس سال میں ہو رہا ہے جب آدمی پندشہر ہو جاتا ہے؟“

یہ بات بھی نہیں کہ وہ لالچی تھے روپیہ جمع کرنے کی ہوس تھی یا اچھا کھانے پینے اور

زندگی عیش و آرام سے بسر کرنے کا خیال تھا۔ اس لیے کہ وہ صرف پیٹ بھرنے اور قومی کام کرنے کی خاطر ہر کڑی سے کڑی مشکل برداشت کر لیتے تھے۔ ایک مصنف اپنے خیالات کو اپنی تصانیف میں ظاہر کر کے قوم کو بیدار کر سکتا ہے۔ اور پریم چند یہی کر رہے تھے۔

اس کے لیے وہ اپنا دماغ اور دولت دونوں چیزوں کو فیاضانہ لٹا رہے تھے اور اس دھن میں انھیں نہ اپنے لباس کی پروا تھی اور نہ اپنے کھانے پینے کی۔ یوں بھی وہ دائمی

مرض کا شکار تھے اور اچھی غذاؤں سے مجبوراً اجتناب کرنا پڑتا تھا جس کی عادت ان میں بہت کم تھی۔

اخلاق و عادات | وہ خود ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بڑی آفتیں اور مصیبتیں جھیل کر تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہوئے تھے اس لیے ان میں کبر و نخوت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ ہر ایک سے ہنس کر ملتے اور انتہائی اخلاق و مروت سے پیش آتے لوگ ان کو خطوط لکھ کر ان کے دوست بن گئے تھے جب وہ ہندوستان کے مسلہ اذیب بھی بن گئے اس وقت بھی ان میں رعونت اور تکبر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے برخلاف وہ۔

نہدشاخ پر میوہ سر بر زمین

کے مصداق بن گئے۔

بے تعصبی | انہوں نے کبھی نہ اپنی زبان سے کسی کا دل دکھایا اور نہ قلم سے۔ مذہبی رواداری اور بے تعصبی میں وہ ضرب المثل تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اردو کو چھوڑ کر ہندی زبان کو محض اس لیے اختیار کیا کہ وہ اردو کو ترقی نہیں دینا چاہتے تھے لیکن ہم جہاں تک غور کرتے ہیں نتیجہ ایسا نہیں پاتے۔ جس طرح افسروں کے ڈر سے (سوزوٹن) کے ساتھ انہوں نے اپنے قلبی نام ذاب رائے کو دفن کر دیا اسی طرح پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر انہوں نے ہندی میں لکھا۔ اور اس میں انھیں مالی فائدہ ہوا۔ اردو کی کسی کتاب میں لکھنے پر بھی وہ فکر معاش سے اتنے آزاد نہ ہو سکے جتنے ہندی میں چند افسانے اور ناول لکھ کر۔ اس کو تعصب پر محمول کرنا ان کے ساتھ نا انصافی کے مرادف ہو گا۔

بردباری | ہر مصیبت میں صابر و شاکر رہنا ان کا شیوہ تھا بڑی سے بڑی مصیبت بھی انہیں پست ہمت نہ کر سکتی تھی ایک دفعہ انہیں خود اپنا تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہ تھے ان کی بیوی نے انہیں کپڑے خریدنے کے لیے روپے دیے تو انہوں نے پریس کے ملازمین میں تقسیم کر دیے۔

اس سے ان کے جذبہ ایثار و ہمدردی اور رقیق القلبی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اور ایسی کئی مصیبتیں تو جسمانی ہیں جنہیں بعض انسان تو خندہ پیشانی سے تحمل جاتے ہیں اور بارود پر بل نہیں مانتے دیتے۔ اور اکثر لوگ تو مجبوراً جھیلنی ہی پڑتی ہیں۔ لیکن ماں باپ کو اولاد کا غم جیسی مصیبت ہے اس سے بڑھ کر مصیبت اس وقت شاید ہی کوئی نظر آئے اس وقت بھی پریم چند میں وہی سکون اور وہی صبر و استعجال نظر آتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب ان کا ایک پچھچیک کے عارضہ سے انتقال کر گیا تو فحشی دیا نرائن نگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”تقدیر نے تو اپنی دانست میں سزا دی ہوگی لیکن یہاں فکروں کا آدھا بوجھ سر سے دور ہو گیا

مجھے بھی مرنے دیجئے اس گوشہ میں۔“

جب وہ خود مرنے لگے تو بجائے اس کے کہ انہیں عام انسانوں کی طرح اپنی موت پر افسوس ہوتا اور ڈاکٹر اور عزیز واقربا تسکین دیتے اٹا وہی اطمینان دلاتے ہیں مرنے سے پہلے انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔

”تھیں میری روح و قلب کی طاقت ہو۔ گھر نامت۔ کیونکہ تم بھی یہاں بیٹھی نہ رہو گی۔“

یہ اس بلند مرتبہ مصنف کا کردار ہے جس نے افسانے کی دنیا میں نام پیدا کیا اور اردو ادب کو معراج کمال تک پہنچنے میں مدد دی۔

تصویر کے پریم چند | مرزا محمد عسکری مترجم تاریخ ادب اردو سکینڈ نے پریم چند کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

”میانہ قد۔ چھریا بدن۔ کتاب رو چہرہ۔ ناک نقشہ نہایت درست۔ آنکھیں بڑی اور نمایاں سفید صاف باندھے ہوئے جو ان پر بہت زیب دیتا تھا۔ ایک اور تصویر ہے پستہ قامت۔ ڈبل پتلے آدمی تھے مگر مضبوط۔ پنجر کھولنے پر انگلیوں کو موڑنا معمولی انسان کے لیے آسان نہ تھا ان کی وضع قطع سادی تھی۔ ایکس۔ پاجامہ یا کھلے گلے کا لمبا کوٹ پہنتے تھے غرض وہ اتنے سادہ کپڑے پہنتے تھے کہ اس سے زیادہ تصویر ہی نہیں ہو سکتا۔ ان کی ذاتی ضروریات اس قدر کم تھیں کہ چھوٹے بیٹے پر رہتا تھا گاندھی نظر آتے تھے۔“

تیسرا باب۔ افسانہ۔ ارتقا اور فن

افسانہ کیا ہے | اب ہم یہ دیکھیں گے کہ پریم چند نے جس صنف ادب کو چار چاند لگا دیے وہ کیا ہے اور اس کی نشوونما کس طرح ہوتی ہے۔

افسانہ کہانی ہے، ایسی کہانی جو ہمیں ہمد سے لحد تک بہلاتی رہتی ہے۔ ہم اپنے بچپن میں اس کے لیے گوش برآواز رہتے تھے۔ لڑکپن میں ان کہانیوں کو مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ جوانی کی کئی راتیں ہم نے کہانیاں پڑھنے میں گزار دیں۔ غرض جہاں ہم بہل جاتے ہیں ان باتوں میں ہمیں دلچسپیاں اور رنگینیاں نظر آتی ہیں اور کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب کہانیاں ہیں البتہ ان کہانیوں کے معیار جدا جدا ہیں۔ کوئی کہانی بہن بے جان اور پچھسی معلوم ہوتی ہے اور کوئی جاندار۔ کوئی ہمیں ہنسنا سی ہے اور کوئی رلاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی پڑھنے سے ہمیں رنج ہو رہا ہے ہم اپنے دل کو مسوس رہے ہیں لیکن پھر بھی پڑھے جاتے ہیں۔ بعض وقت آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہا دیتے ہیں لیکن کہانی نہیں چھوڑتے اور جب کہنے والا اس کمال سے کہے تو اس کے کیا کہنے۔ جب یہ دلچسپی کمال کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو تاثیر بن جاتی ہے اور ہم مجسم درد۔

قدیم تخیل | ان کہانیوں کے متعلق قدیم تخیل یہ ہے کہ یہ دل بہلائی کے لیے کہی جاتی تھیں۔ بادشاہوں کے دربار میں داستان گو مقرر تھے جو سردر بار بھی کہانیاں کہتے اور یہی کہانیاں بادشاہ کے لیے لوری کا کام دیتیں۔ گلی کی نگڑ پر یا کسی دروازے کے سامنے بڑے بوٹھے اور بچے جمع ہو جاتے اور وقت گزاری کے لیے کہانیاں کہی جاتیں۔ مگر ان دونوں کہانیوں میں فرق ہوتا بادشاہ اپنے شایان شان کہانی سنتا۔ ماضی کے یادگار قصے اس کے گوش گزار کیے جاتے اور بچوں کو بوٹھے انہیں کہانیوں سے جری اور مرد میدان بناتے۔

زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور کہانیاں بھی اپنے پہلو پدلتی رہیں۔

قدیم افسانوی ادب | الیڈ اور ڈیسی اور رستم و اسفندیار کی کہانیوں کا دور گزر گیا اور گلستا بوستاں اور ایسیپ کی کہانیاں کہی جانے لگیں۔ جب زمانہ اور بھی گزر گیا تو کہانیوں میں رومانیت پیدا ہو گئی اور ان میں عشق و محبت کے گن گائے جانے لگے۔ ان کو فن کار تہ یورپ اور امریکہ میں حاصل ہوا۔ واشنگٹن ارونگ اور ڈکارا لین پونے امریکہ میں۔ لارنس۔ جوائس اور سیون سن نے انگلستان میں اس پر خاص پابندیاں عائد کیں۔ اس سے پہلے تک من گھڑت قصے لکھے جاتے ملن جنت کی اور ڈانٹے و وزخ کی سیر کرتا۔ تخت ہوا میں اڑتے تعویذ اور فلیتے بڑے بڑے مافوق الفطرت کام کر جاتے۔ اس کے بعد محبت کی دنیا آباد ہوئی۔

لیکن مذکورہ بالا مغربیوں نے ان تمام چیزوں سے ہٹ کر زندگی کے ہر مرحلہ کو اپنے انسانے کا موضوع بنا لیا۔ ”انسانی جذبات۔ غم و غصہ۔ سرور و انبساط۔ رشک و حسد۔ ظلم و ستم۔ رحم و کرم۔ خوف و ہراس۔ حسن و عیب۔ اور معصیت و عفت فطرت اور اس کی نیرنگیاں فلسفہ اور اس کی باریک بینیاں نفسیات اور معاشرہ غرض کوئی ایسی چیز نہیں بچی جسے افسانے کے پلاٹ کے لیے استعمال نہ کیا گیا ہو۔“

یہ لہر دنیا کے سارے ادب میں دوڑ گئی۔ روس۔ اٹلی۔ امریکہ۔ ترکی۔ انگلستان۔ غرض کہ ہر اعلیٰ زبان میں ایسے افسانے لکھے جانے لگے اور افسانہ آسمان سے زمین پر آرہا۔ یعنی ”ادب برائے ادب“ کا خیال فرسودہ ہو گیا اور ادب برائے زندگی کی برقی لہر دوڑ گئی اب افسانوں کے کردار ہم آپ جیسے انسان بن گئے ورنہ اب تک فوق المائیں ہی تھے۔ مغربی ممالک کے سیاسی رجحانات کا اثر ادب پر بھی پڑتا گیا اور عصری افسانہ نگاروں نے مقامی سیاست اور حکومت کے تالے بانے سے اپنے افسانے تیار کیے اور

اس طرح حکومت کے مظالم رعایا کے سامنے آتے گئے اور ان کے قلوب کو آزادی کے پنگوروں میں جھلانے لگے چنانچہ روس اور فرانس کا انقلاب افسانہ نگاروں ہی کا ہرمنٹ ہے جن میں ڈاسٹفسکی، گورکی، تر جینیف اور چیخوف اور فرانسیسوں میں ڈالتیر سے مپاسا تک کم و بیش سب شامل ہیں۔

ہندوستان میں افسانہ نگاری | ان اثرات سے ہندوستان بھی بچنے نہ پایا۔ یہاں بھی افسانہ کے ارتقائی مدایح وہی ہیں جو اور دوسرے ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ مگر قدر کے بعد جس طرح تمام دوسرے اصناف ادب میں تغیر ہو گیا اسی طرح افسانہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور عصری افسانہ نگاروں نے باغ و بہار، آرائش محفل اور فسانہ عجائب کی راہ کو قطعاً ترک کر کے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔

نذیر احمد ”اردو کے پہلے ناول نگار ڈبٹی نذیر احمد ہیں بعد از قیاس داستاؤں کی جگہ اصلی واقعات اور صحیح معاشرت کو قصہ کی صورت میں پیش کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔“

”ان کی زبان بہت آسان صاف اور سادہ ہوتی ہے البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ لاتے ہیں اور کہیں رنگین عبارت اور صنایع بدایع سے اور بعض مواقع پر انگریزی الفاظ سے کام لیتے ہیں جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوب صورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ ان کی نثر کا جو ہر اعلیٰ ان کا نظریانہ رنگ ہے۔۔۔۔۔ ان کی ظرافت بہت بلی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑ پن مطلق نہیں ہوتا۔“

نذیر احمد نے افسانوں میں گھر بلو زندگی کے واقعات صاف صاف بیان کیے ہیں اور اس وقت کی ہر لحاظ سے تمدنی کیفیت پیش کر دی ہے لیکن وہ دہلی کے باہر نہ نکل سکے۔ ان کے افسانے کی ساری چیزیں دہلی کی ہیں۔ انھوں نے فطرت سے زیادہ قربت حاصل کر لی

اور لوگوں کے لیے دلچسپی کے سامان فراہم کر دیے اور ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ ان کے ناولوں کے نمونے نامکمل سہی لیکن نقش اول کہلانے کے مستحق ہیں۔

سرشار | سرشار نے اپنے وطن لکھنؤ کی لکھنؤ کی لکھنؤ کی زبان استعمال کی۔ محاورہ اور روزمرہ کی شوخی کو اپنا خاص رنگ بنایا طرز ادا مقفی ضرور ہے لیکن ناموزوں نہیں معلوم ہوتی۔ انھوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے موزوں تھا۔ ان کے قصے میں لوگ نفسِ قصہ سے زیادہ عمارت سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے ناول میں خامیاں ضرور ہیں ان کے ناولوں میں پلاٹ اور کردار میں یکسانیت نظر نہیں آتی لیکن ان کی زبان اور اسلوب کی دلچسپی اور دلکشی میں پڑھنے والا اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کو ان خامیوں کا کم احساس ہوتا ہے۔

شرار اور سجاد حسین | یہ خامیاں سجاد حسین کے ہاں یکسر ندرت ہیں ندرت بیان کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ بلند ہے مزاحیہ ناولوں کی کامیابی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ شرار نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور دفتر کے دفتر اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ ان کی منظر نگاری مشہور ہے۔ ناول کا ہر باب اور ہر باب کے تقریباً دو صفحے منظر کشی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر ان کے ناولوں میں کردار کے نام بدل دیے جائیں تو پھر ناولوں کو ممیز کرنا مشکل ہو گا۔ تاریخی ناولوں میں صداقت کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ تاریخ نہیں لکھ رہے تھے بلکہ ان کا مطمح نظر ناول لکھنا تھا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تاریخ اور ناول میں کیا فرق باقی رہ جاتا۔ ان خامیوں کے باوجود بھی انہوں نے اردو ناولوں کو انگریزی ناولوں کے شانہ بہ شانہ لاکھڑا کیا۔ انہوں نے اردو ادب میں اسکاٹ کی جگہ لی۔ اس کاٹ نے درپردہ

تبلیغ کی اور باکمال ناول نگار بنا۔ شہر اپنے مقصد کو چھپانے کے اور لوگوں کو انجنت نامی کا موقع مل گیا۔

محمد علی اور راشد الخیری | حکیم محمد علی بھی انھیں کے ساتھی ہیں ”راشد الخیری نے نذیر احمد کی اتباع کی اور پھر ان میں انفرادیت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے عورت کی المناک زندگی کو اپنا موضوع بنا لیا اور اس طرح اردو افسانے میں ان کو خاص جگہ مل گئی۔ مگر ہر افسانہ ایک ہی انداز رکھتا ہے اور دو تین چیزیں پڑھنے کے بعد وہ تازگی محسوس نہیں ہوتی ہے۔“ غم و الم کی شدت جس کو بیان کرتے ہوئے زبان رکتی ہے ان کے قلم سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو جاتے ہیں اسی رجحان کی وجہ سے علامہ راشد الخیری کے ساتھ ”مصوّم“ کا لقب بہت زریب دیتا ہے۔

موجودہ افسانہ نگار | اب وہ زمانہ تھا کہ ساری دنیا اقتصادی مصائب میں گرفتار تھی۔ سیاسی انتشار اور حکومت اور رعایا کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے ان چیزوں کا اثر ادب پر بھی پڑا ناولوں کے لکھنے اور پڑھنے کی فرصت نہ پا کر لوگ مختصر افسانہ نویسی اور افسانہ خوانی کی طرف راغب ہوئے اور مصنفین کو ان کی طلب پوری کرنی پڑی۔ ان میں نیاز۔ پریم چند۔ پطرس۔ رشید احمد صدیقی اور مجنون گورکھپوری پیش پیش رہے اور ہندوستانیوں کے قومی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، تاریخی اور سماجی حالات کو اجاگر کیا اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔“ اور یہی وہ ادب ہے جو دنیا کے اور دوسرے عصری ادبیات کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان لکھنے والوں میں اور بھی چند نام ہیں جن میں سجاد حیدر، سدرشن، اعظم کروی، افسر میرٹھی، علی عباس حسینی، حامد علی خاں،

ایم اسلم اور عظیم بیگ چغتائی قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے طبع و کلام کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کی ہیں اور کر رہے ہیں۔ محبت اور عورت کے دلکش نظریوں پر بحث کی جا رہی ان کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ پہلے گروہ میں نیا ز مجنوں، سجاد حیدر اور ل۔ احمد ہیں۔ ان لوگوں نے زنانہ ادب لطیف کی بنیاد ڈالی اور ان کے نزدیک عورت۔

”محترم ترین مخلوق، ہم پر حکمرانی کرنے والی، ایک لذت ہے جسم ایک تسکین ہے
مشکل ایک سحر ہے مرئی ایک نور ہے مادی۔“

ان کے نزدیک عورت کا حسن صرف دیکھنے کے لیے ہے آزاد و میدہ، آغوش سے دور۔
مجنوں کہتے ہیں محبت بلا از دواج قائم رہ سکتی ہے اور اس میں مذہب و ملت کی تفریق بے مقصد ہے۔
دوسرا گروہ عورتوں کو برائیوں کا خزینہ قرار دیتا ہے۔
انہیں جھگڑوں سے تنگ آکر علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس : آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
راشد انجیری، پریم چند، سدشن اور سلطان حیدر جوش کے افسانوں کی عورتیں
ہندوستانی ہیں جن کا خاص جوہر نساہیت ہے جو شرم و حیا کے مجھے ہیں۔ پریم چند، سدشن
اعظم کرپوری اور عظیم بیگ نے راجپوتینوں کی عظمتیں بیان کر کے ہم پر ان کا سکہ بٹھا دیا۔
ان کا اپنی آن کے لیے سب کچھ قربان کر دینا۔ سب کچھ چھوڑ بیٹھنا لیکن بات کو بنائے
رہنا اتنے موثر اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم وا دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی
تخلیفوں میں ہم روتے ہیں اور ان کی خوشی کے موقع پر ہم بھی خوش ہوتے ہیں غرض ان کی
تحریر پر ہم اس طرح چلتے ہیں گویا ایک گمراہ اندھیرے میں دور ٹٹھاتے دیے کی طرف
چلا جاتا ہے۔

پریم چند نے عورتوں اور دوسرے ہر نقطہ خیال کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ سدیش نے ہندوؤں کے گھرانے کی حالت کا خاکہ کھینچا اور راشد انجیری اور فضل حق قریشی نے مسلمانوں کے گھرانوں کی۔ حامد انڈانسر نے ہندوستانیوں کے عام ذہنی رجحانات کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا۔ اور پریم چند کے اصلاحی رنگ سے متاثر ہو کر سدیش نے اعظم کرپوی۔ علی عباس حسینی اور پروفیسر مجیب نے کامیاب افسانے لکھے۔ انسر کا ڈالی کا جوگ علی عباس کا افسانہ آئی سی ایس۔ اور پروفیسر مجیب کے افسانوں میں کیمیاگر۔ باغی اور پتھر نہایت کامیاب ہیں۔ کیمیاگر میں حکیم مسیح کا جذبہ خدمت اور حب وطن۔ باغی میں بغاوت کے باریک نکات اور بڑے بابو کا کردار اور پتھر میں ہندوستانیوں کا تساہل بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے اور افسانہ کا خاتمہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پروفیسر مجیب نے ”روسی ادب“ پر تفصیلی اور مبسوط تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے۔ روسی ادیبوں کا اثر بھی ان کے افسانوں پر نظر آتا ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی واقعات بیان کرتے ہیں اور کرداروں کی سیرت نمایاں ہوتی جاتی ہے اور ان کی ساری زندگی پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی افسانہ نگار ہیں جن کا ذکر ہم نے اگلے باب میں کیا ہے۔ غرض اس طرح سارے ہندوستان کی تہذیب تمدن کا مجموعی خاکہ ہمارے افسانوی ادب میں پیدا ہو گیا۔

ترقی پسند ادب | پریم چند اور عظیم بیگ نے انتقال کیا اور ان کے بالکل آخری زمانہ میں چند ایسے مصنفین منصفہ شہور پر آئے جو عصری میلانات کو شدت کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرنے لگے۔ ان کے گروہ کو ہم ترقی پسند مصنفین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دور اشتہالی حقیقت نگاری کا دور ہے جس میں زندگی بجلی کی طرح کوند رہی ہے اور سراج کی عمارت کی کڑیاں جٹخ رہی ہیں۔ اب زندگی پر پردہ کم پڑا دکھائی دیتا ہے اور سمجھنے والے اسے بھی اٹھا دینے پر مصر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں

ہیں بیک وقت مشین کی پوری پیچیدگی سے آشنا کر دیتے ہیں سماج میں افراد کی جسمی اور معاشی تشنگش کو اس کے تعلقات کے ساتھ سمجھنا انھوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لیکن ان کے بعض اراکین اپنے افسانوں میں سماج کی اتنی عریاں تصویریں پیش کرتے ہیں کہ انھیں دیکھنا ثقہ طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ ”نئے زاویے“ کے بعض افسانے رشید جہاں کا افسانہ (آصف جہاں کی بہو) عصمت چغتائی کی (ضدی) اور (محاف) مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں اس سے ہمارے ادب میں ترقی کے امکانات کم ہیں اور ہمیں مایوسی ہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر راجندر سنگھ بیدی اپنے افسانوں کے مجموعے (گرھن) کے دیباچے میں ہمیں یقین دلاتے ہیں۔

”ایک نیا اہم دور کٹھالی میں ہے۔ آندھی سے پہلے جو ایک خاص قسم کی اس ہوتی ہے اس کا ظہور ہمارے ادب میں بھی ہے اس میں کوئی بھی جنبش کوئی بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ ایک خاص قسم کے تخریبی و اتلائی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن سے جو قطعاً مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ ترقی پسندی کے رسوائے عام نام کے تحت جو جسمی کیمچرا اچھا لا جا رہا ہے اور جس سے لوگوں کو ادب کی صورت مسخ ہو جانے کا بے بنیاد اندیشہ ہے ایک ایسے ہی انحطاطی دور کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن۔“

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔۔

بیدی کی یہ تلقین اس لحاظ سے صحیح ہے کہ ترقی پسند ادبوں میں اچھے اور برے سبھی شامل ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے بعض اراکان شہرت کے متلاشی ہیں اور بعض کی نظر سماجی حالات پر گہری ہوتی ہے۔ موزر الذکر طبقہ واقعی طور پر ترقی پسند ادیبوں کے خوابوں کی تعبیر کو پورا کرے گا اور بیدی صاحب کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے۔ ان ادیبوں کے افسانوں کے متعلق اردو مہم کے ایک نمبر میں شاہد بلطین نے لکھا ہے کہ اس نئے ادب سے بھوک اور نفسانیت کو نکال لیا جائے تو بہت کم باقی

بچے گا۔ اس ہی مائتگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر نے ادب کے پرانے ذخیروں سے
 ایک قلم منہ موڑ لیا ہے اور ان کو سرے سے قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔ ادب لطیف اگست
 ۴۴ء میں ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ”ہمارا ترقی پسند ادب بھی مغرب کی کورانہ تقلید میں زمین
 کو ضرورت سے زیادہ کریدنے لگا ہے وہ اس آسمان کو بالکل بھول جاتے ہیں جس پر سرمایہ
 ملت ٹیگور سے لے کر اچیس کی وضاحت سرت چندر چٹرجی نے اپنے لازوال افسانوں میں کی“
 ادب کو زندگی کا آمینہ ہونا یقیناً ضروری ہے اور اگر یہ نہ ہو تو ایسا ادب جو دونوں ہی
 کے کام کا رہ جائے گا۔

اپنی تائید میں ہم ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے ایک رکن اختر انصاری کے
 الفاظ پیش کرتے ہیں۔

”ادب کی دو خصوصیتیں ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور
 براہ راست تعلق رکھتا ہو دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد
 کے ماتحت عمل میں آئے ہے۔
 منشی پریم چند کہتے ہیں۔

”ہم ادب کو تفریح اور تفریح کی چیز نہیں سمجھتے ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھراؤتے
 جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو۔ تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں
 کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سوائے نہیں
 کیونکہ اور زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی۔“

اس طرح ترقی پسند ادب کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے بعد ہم ان مصنفین کے کارناموں
 پر نظر ڈالیں گے جو اپنے آپ کو ترقی پسند ادیب سمجھتے ہیں اور سرسری طور پر معلوم کریں گے
 کہ وہ اپنے مقاصد کی کہاں تک تکمیل کر رہے ہیں۔

سجاد ظہیر کا نام سر فہرست ہے اس لیے کہ وہ انجمن کے پہلے معتمد ہیں۔ انھوں نے

اپنے دوران قیام یورپ میں فرانس کے مزدوروں کی بیداری، آسٹریا کا نا کام مزدور انقلاب اور بلغاریہ کی کیوسنسٹ پارٹی کے ڈیمیتروف کے مقدمہ کے واقعات دیکھے اور سنے اور مغربی مصنفین کے ساتھ ساتھ خود بھی ڈیمیتروف کی جرأت و مہمت سے متاثر ہوئے اور اس طرح ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں شریک ہو گئے (انگاریے) کی کہانیاں کے بعد (بیمار) (ایک ایکٹ ڈرامہ) اور (لندن کی ایک رات) ایک طویل مختصر افسانہ لکھا۔ ان کے دوسرے ساتھی احمد علی ہیں جو اپنے کام میں سرگرمی کے لحاظ سے سجاد ظہیر کے بعد آئے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ہندوستان آکر ترقی پسند ادب کا پرچار کیا اور احمد علی کے علاوہ اور بھی ادیب اور شاعر انجمن کے مقاصد کی بلندیوں پر نظر رکھے ہوئے رکن بن گئے۔ احمد علی کی تالیف (انگاریے) ترقی پسند مصنفین کا پہلا کارنامہ ہے۔ (جہاڑوں کی ایک رات) احمد علی کا افسانہ ہے جو بہت ادیبانہ شان کا حامل ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں، اختر انصاری۔ حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، اختر حسن رائے پوری۔ سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر۔ اوپندر ناتھ اشک۔ راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، ملک راج آنند، گوپال متل، فیاض محمود، علی عباس حسینی، پیرزادہ احمد ندیم قاسمی اور احتشام حسین یہ سب اسی کشتی کے سوار ہیں اور اپنے حسبِ مقدور کام کیے جا رہے ہیں۔ ان میں اختر رائے پوری، اختر انصاری، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اشک، بیدی، حسینی اور قاسمی تیز نگاہ ہیں۔

”عصمت چغتائی، جنسی آزادی کا حامی ہیں ان کے پلاٹ ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں پلاٹ۔ کرداروں کی تخلیق اور زبان و بیان میں سب ترقی پسند افسانہ نگاروں سے آگے ہیں اور ان کے جیسے اس قدر بے ساختہ اور برجستہ ہوتے ہیں کہ کہانی بلند ہو جاتی ہے ان کا آرٹ حد درجہ بے باک اور خوفناک حد تک حقیقت پرست ہے۔“

”اشک کا معمول ہے کہ یا تو وہ ایک خالص فنی چیز لکھتے ہیں یا پھر مستی پریم چند مرحوم کی طرح کسی سماجی برائی کو مرکز بنا کر اس کے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے ہیں اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس برائی کا ایسا گہرا اثر ڈالتے ہیں جو مدتوں محو نہیں ہوتا۔“

”اختر انصاری جس نقطہ نظر سے سماج کے مناظر کو دیکھتے ہیں اسی طرح پیش کرتے ہیں تصنع نہ ان کے بیان میں ہے نہ اسلوب میں۔ رومان جس نے آج کل ادب کو گندہ کر رکھا ہے ان کے ہاں اس کا دخل نہیں ہے۔“

”بیدی کا رجحان تخلیقی ہے وہ اپنی کہانیوں میں پنجاب کی زندگی اور اس کے رسم و رواج اور ان کی اصلاح پر زور دیتے ہیں۔ بیدی زندگی کے تجربوں کو صرف نئی شکل میں نہیں بلکہ زیادہ موثر شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ سماج کی ناجائز یا بندوں سے ان کی بغاوت و صیسی آئینج کی طرح کھیل رہی ہے۔ اور جب کسی کسی جگہ شعلہ کی لپک اٹھتی ہے تو اس کی روشنی میں بہتے محل گرتے دکھائی دیتے ہیں۔“

”حسینی رنگینی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ دیہات سے متعلقہ افسانوں کے موضوع میں بلا کا طنز اور اس کے اظہار میں قیامت کی صناعت نازک آفرینی سے کام لیا گیا ہے۔ زبان کی نرمی افسانے کو کہانیوں کی طرح پر کیف بناتی ہے۔ منٹو کا تنوع۔ مشاہدہ زبان و بیان کی لطافتیں سب میں ایک پختہ کار افسانہ نگار کی شان ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک نیا موضوع ملتا ہے۔“

دیگر اراکین میں بھی کم و بیش یہی صفات پائی جاتی ہیں جن کی مشق زیادہ ہوتی جا رہی ہے ان کی نظر سطحی نہیں رہی بلکہ وہ سماج کی تاریکیوں میں دیے جلا رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ ان کی کوششیں بار آور ثابت ہوں۔

افسانہ کی ساخت۔ خارجی پہلو | ساخت کے اعتبار سے افسانے کے دو پہلو ہیں ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ خارجی پہلو سے مراد افسانہ کا سرسری خاکہ جس پر افسانہ کی بنیاد کھڑی کی جاتی ہے اور داخلی پہلو سے مراد اس کا خاکہ۔ کردار۔ اسلوب۔ زبان۔ موضوع الفاظ کا استعمال اور ہر وہ خوبی جو افسانہ کو موثر اور دلچسپ بنا سکے۔ اس کے بنیادی عناصر آغاز افسانہ۔ مقصد کی ایک نظری یا افسانہ نگار کا نقطہ خیال کشمکش۔ منہا اور خاتمہ ہیں۔

افسانہ کی ابتدا اور انتہا | افسانہ کی ابتدا جتنی اچھی ہوگی بڑھنے کے لیے لوگ اسی قدر راغب ہوں گے اور پہلی سطر سے دوسری سطر کی طرف رغبت ہوگی۔ طول طویل تنہید یا موقع و محل کے مناظر اب افسانہ کی ابتدا کے لیے سہم قابل کا حکم رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ افسانہ نگار ابتدا کے بعد اپنا مقصد واضح کر دے کہ وہ اپنے کرداروں سے کیا کام لینا چاہتا ہے تیسری چیز کرداروں کے خیالات کا لحاظ اور پھر اس کی انتہا جہاں پڑھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ اختتام کس طرح ہوگا اس کے بعد خاتمہ بھی اسی طرح اچانک ہوگا۔ اس لیے کہ جب قاری نے تصفیہ کر لیا ہے کہ آگے یہ انجام ہونے والا ہے تو اس کو زیادہ انتظار میں رکھنا افسانہ کی خامی کے مرادف ہوگا۔ بعض اچھے افسانہ نگار اپنے افسانے اس طرح ختم کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شبہ میں رہتا ہے کہ ابھی افسانہ اور باقی ہے حالانکہ وہ اپنا مقصد اور نقطہ نظر اپنے کرداروں کے ذریعہ ظاہر کر چکے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بڑھتی ہوئی دلچسپی کے ساتھ باہمی ربط قائم رہے ورنہ جہاں سے لغزش ہوگی وہاں افسانہ خوان کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔

داخلی پہلو | داخلی حیثیت سے پلاٹ کا بہتر ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے کتاب سے زیادہ قابلیت کی ضرورت ہے جس کا مطالعہ وسیع اور جس کی نظر گہری ہوگی وہ آسانی سے پلاٹ بنا سکتا ہے۔ لیکن اس کو حسب موقع پھیلانا اور سنوارنا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ دوسرا جز کردار نگاری ہے۔ ”یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ

کرداروں کو جیتی جاگتی تصویریں ہونا چاہئے انسانی کردار کی صحیح نقلیں ہی جیتی جاگتی تصویریں ہو سکتی ہیں۔ صاحب کمال کردار نویس وہی مصنف سمجھا جاتا ہے۔ نقل کو اصل کر دکھائے۔ واقعات کردار کو ابھارتے ہیں یہ قانون فطرت ہے۔

انسان کی نفسیاتی قسموں کی کردار کشی کرنے والے مصنف زیادہ کامیاب ہوتے ہیں کرداروں کا اعلیٰ خصوصیات کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے پڑھنے والا کرداروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بشرطیکہ کرداروں میں لے چلنے کی قوت ہو۔ اگر ان کی قوت زائل ہو جائے تو افسانہ شتر بے ہمار بن جائے گا۔ افسانے کا ارتقا و بھی تدریجی ہونا ضروری ہے۔ اس کی زبان میں حلاوت اور شیرینی ہونی چاہئے اسلوب بیان بھی افسانے میں خاص اہمیت رکھتا ہے اگر خدا داد ملے ہو تو پھر افسانہ نگار کے وارے نیا رہے ہیں اور نہ ہو تو اکتساب سے کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ ”تمثیلی رنگ یعنی ڈرامائی انداز بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن لطیف الدین احمد اکبر آبادی اس کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اس سے گفتگو اور بحث و تمحیص مراد لیتے ہوں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ قاری افسانہ پڑھتا ہے لیکن طرز تحریر اس کو ایسے مناظر بتاتی ہے جس کو وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ عبارت پڑھ کر وہ ہنستا بھی ہے اور عبارت ہی پڑھ کر وہ اپنے رخساروں پر گنگا جمننا بچتے دیکھتا ہے یہی افسانہ نگار کی سحر کاری ہوتی ہے

کم سے کم الفاظ کا استعمال بشرطیکہ مفہوم میں الجھن نہ ہو زور بیان اور طرز ادا میں زبان کی گھلاوٹ اور روانی الفاظ کا انتخاب اور فقروں کا دروبست افسانے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانے کو خواہ مختصر لکھے یا طویل اس کی طرز ادا اور زبان اس کی کامیابی اور ناکامی کی ذمہ دار رہتی ہیں۔ اسی سے کشش

تایم رہتی ہے۔ حقیقت بنگاریں اور مکالمہ بھی جو ملازم ہیں۔ اگر افسانہ نگار حقیقت سے دور ہو جائے تو پھر وہ مافوق الفطرت اشیاء کا ذکر کرے گا جس کا زمانہ گذر چکا۔ مکالمہ سے تحریر میں کمی ہو جاتی ہے اور کردار کو سمجھنے میں بہت زیادہ سہولت ہوتی ہے۔ بہر حال افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح پہلے ہی فقرے سے قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لے اور پھر جوں جوں افسانے کو بڑھا لے اپنے ناظر کی دلچسپی میں اضافہ کرتا جائے حتیٰ کہ کلائمکس پر پہنچ کر اس طرح افسانے کو ختم کرے کہ جو اثر وہ قاری پر ڈالنا چاہتا ہے وہ تمام تر شدت کے ساتھ اس پر مسلط ہو جائے۔

چوتھا باب۔ پریم چند کے موضوع

مقصد افسانہ نگاری | پریم چند نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور جس موضوع پر انہوں نے لکھا اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا ان کے افسانوں سے اگر ان کے خیال یا موضوع کو الگ کر لیا جائے تو سارے افسانے بالکل بے رنگ اور تلخ ہو جائیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنی معاشرت اور تمدن کے نقائص کو پیش کیا جائے اور ان کی ممکنہ اصلاح کی جائے۔ ان کے اس جذبہ خدمت نے ان کے قلم سے ایسی ایسی چیزیں لکھوائیں جو اردو ادب کی زندگی تک ہمیشہ بہ نظر استحسان دیکھی جا سکی۔

ان کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد ہمارے ذہن میں مختلف خیالات گھومتے ہیں کبھی ہم انھیں راجپوتوں کے دربار کا نیم تاریخی داستان گو سمجھتے ہیں اور کبھی دیہاتیوں کا درد مند، کبھی مصور فطرت اور کبھی رفا رمر، کبھی ہم انھیں ہندوستان کے رسم و رواج کو قید و بند سے آزاد کرانے والا رہنما پاتے ہیں اور کبھی بازار حسن کا گرگ باران دیدہ سمجھنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ غرض وہ ہر رنگ کی تصویر کھینچتے ہیں جو اتنی دلکش ہوتی ہے کہ ہماری نظر میں ہٹائے نہیں ہتھیں یہی مصور کی کامیابی کا راز ہے۔ تصویر پر کسی نے گہری نظر ڈالی تو مصور کی محنت ٹھکانے لگ گئی پریم چند کی تصویریں بھی دلکش اور نظر افروز ہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے۔

ازدواج بیوگان | ان کے مختلف موضوعات کو جن کا تعلق سماج اور معاشرت سے ہے ہم مقامی رنگ سے تعبیر کریں گے۔ کوئی ناول اور کوئی افسانہ اس سے خالی نہیں نظر آتا۔ رسم و رواج کی بندشیں انھیں طاقتور قفس بنا دیتی ہیں۔ اور وہ اسی کیفیت سے متاثر ہو کر

اپنا پہلا ناول (ہم خرمادہم ثواب) لکھتے ہیں۔ دھنک بھاری لال کی تقریر کا یہ حصہ ان کے ناول کی بنیاد ہے۔

”حضرت سب غریبوں کی جڑ بھاری لاپرواہی ہے۔ ہماری حالت بالکل نیم جان مریض کی سی ہے جو دوا کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے مگر منت تک نہیں لے جاتا۔ ہاں صاحبو ہم آنکھیں رکھتے ہیں مگر اندھے ہیں ہم کان رکھتے ہیں مگر بہرے ہیں ہم زبان رکھتے ہیں مگر گونجے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم کو اپنی معاشرت کے نقائص نظر نہ آتے ہوں۔ ہم تمام اچھی باتوں کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مگر جس طرح مسائل اخلاقی پر ایمان رکھ کر بھی گمراہ ہوتے ہیں خدا کے وجود کے قائل ہو کر بھی منکر بننے میں اسی طرح اصلاح تمدن سے اتفاق رکھتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کرتے۔“

امرت رائے ناول کے ہیرو مغربی تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے قدیم رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑنے کا عزم کرتے ہیں و دھوا آشرم کی بنا ڈالتے ہیں اس کو کامیابی سے چلا کر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس ناول میں پریم چند نے اردو راج بیوگان پر بہت زور دیا ہے اور بیوہ کے تکالیف کا دلنشیں انداز میں خاک کھینچا ہے۔ مثلاً وہ رام کل کے متعلق اس کے زو عمر میں بیوہ ہونے، شباب کی تمنائوں کو پامال ہونے اور جذبات

کی طوفانی دھارا سے ضبط نفس کا بند ٹوٹنے کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔
 ”اس کا نام رام کل تھا پچاسی دو برس سے رنڈا پا بھوک رہی تھی اس کا سن بھی مشکل سے سولہ سترہ برس کا ہو گا چہرہ چہرہ بھی پرانہ تھا خط و خال نہایت دل فریب۔ اگر پورنا (ایک لحاظ سے ہم خرمادہم ثواب کی ہیروئن) آم کی طرح زرد تھی تو اس کا چہرہ جوش جوانی سے گلابی ہو رہا تھا۔ بالیں تیل نہ تھانے آنکھوں میں کابل۔ نہ نائگ میں سیندور نہ دانتوں میں سی می تاہم اس کی آنکھوں میں وہ شوخی تھی۔ چال میں وہ لچک اور ہونٹوں پر وہ ہنس جس سے ان بناوٹی آرائشوں کی ضرورت باقی نہ تھی وہ گلکتی ادھر ادھر تکتی مسکاتی چلی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ راستہ میں ہزاروں آدمی لے سب کی نظریں ان دونوں عورتوں (رام کل اور پورنا) کی طرف پڑتی تھیں۔ فقرے چمت کیے جاتے تھے مگر پورنا سر کو ادا پر اٹھاتی ہی نہ تھی ہاں رام کل ابھی مسکا کر مسکرا کر معشوقانہ اعزاز سے ادھر ادھر دیکھتی تھی ایک آدھ برجستہ جواب بھی دیتی۔“

اس کے بعد رام کلی کے عادات و اطوار جس انداز میں بیان کیے گئے ہیں وہ نہایت طنزیہ اور چبھتے ہوئے ہیں لڑکیوں کا اپنے عنفوان شباب سے پہلے بیوہ ہوجانا کلی کھلنے سے پہلے مرجھانے کے مرادف ہے اب ایسی دیویاں ہندوستان میں ضرور ہیں جنہوں نے اپنی ساری جوانی بیوگی میں کاٹ دی اور ایسی بھی بہت سی ملیں گی جو پیٹ کے اُلاؤ اور نفسانی خواہشات کے مارے بیوگی کی مصیبت کو برداشت نہ کر سکیں بظاہر بیوہ رہیں اور باطن میں سہاگن۔ پریم چند سلج کو اسی عیب سے بچانے کے لیے ازدواج بیوگان کے حامی تھے۔

رام کلی اور پورنادو متضاد خیالات کے کردار ہیں رام کلی کی بیوگی میں لغزش ہوتی نظر آرہی ہے اور پورنلے اپنی جوانی اپنے شوہر کے نام کی مالا جیتے ہوئے کاٹنے کا عزم کیا ہے۔ مگر کزور عورت کے دل پر مختلف اثرات ڈالے گئے اور وہ امرت رائے (ہیرو) کی محبت کا شکار ہو گئی۔ اور ان سے شادی کر لی۔ اسی طرح رام کلی اور اس کے ساتھ لچھی نے بھی دوسرا عقد کر لیا۔

اس سلسلے میں پریم چند نے اور بھی بہت سی برائیوں کو آشکار کیا ہے۔ بیوہ اور خاص طور پر نو عمر بیوہ کا سماج میں کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ وہ نہایت حقیر اور منحوس سمجھی جاتی ہے۔ صبح اٹھنے کے بعد اس کی صورت کا نظر آنا شگون بد خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کو خوشی کی تقریب میں دور دور رہنا پڑتا ہے اور یہ اس کی خود داری پر ٹھیس لگانے کے لیے بہت کافی ہے۔ اسی پر بس نہیں ہوتا بلکہ اس کی ساری دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ سارے خاندان کی لوٹدی اور خادیمہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ساس کراٹا کا تبین کی طرح اس کی ہر حرکت کی نگرانی ہوتی ہے اور قے و قسوی بھی غریب بیوہ گالیاں اور جوتیاں کھاتی رہتی ہے۔ ہندوستانی سلج میں بہت کم ہیوئیں ایسی ہوں گی جنہیں ان صعوبتوں سے دوچار ہونا نہیں پڑا اور نہ تو تے فیصد انہیں پابندیوں کی شکار ہیں ان تمام جزئیات کو پریم چند نے رام کلی کے مصداق میں ظاہر کیا ہے۔

یہی ناول ہندی میں ”کشنا“ اور کچھ اضافے سے ”پرتگیا“ اور ”پریمیا“ کے نام سے اور اردو میں دوسرے لباس میں ”بیوہ“ کے نام سے شایع ہوا لیکن زیب داستان کے لیے اس میں اکثر جگہ حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ کردار تقریباً وہی موجود ہیں اور اپنا اپنا کام برابر انجام دیتے ہیں۔ یہ پریم چند کی وہ تصویر ہے جس پر انھوں نے نظر ثانی کی ہے۔ اس لیے یہ نقش ثانی کا درجہ رکھتی ہے، ایک خاص بات اس کتاب میں ہیں یہ نظر آتی ہے کہ پریم چند نے اس میں ہمیر و امرت رائے کو بنایا مگر ہیروئن کبھی پریمیا بن جاتی ہے اور کبھی پورنا اور پڑھنے والا کوئی تفسیق کرنے نہیں پاتا۔ اس کتاب کو انھوں نے اردو میں بھی لکھا اور ہندی میں بھی۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ لکھا۔ اس موضوع پر انھوں نے نہ صرف لکھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ازدواج بیوگان کے وہ کس قدر حاجی تھے، اور طرح طرح سے اس پر چار کرنا چاہتے تھے۔

ان کا ایک دلنشین افسانہ ”مالکن“ (داردات) بھی ہے۔ یہ مالکن رام پیاری ہے جو اتفاق سے عین عالم شباب میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ افسانہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

”شیوہ اس نے بھنڈا رکھی کبھی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ”ہو آج سے گرمستی کی دیکھ بھال تمہارے ذمے ہے میرا کچھ بھگوان“

نہیں دیکھا گیا نہیں تو کیا جوان بیٹے کو بوں چھین لیتے۔“

مالکن کے احساس نے رام پیاری کا غم غلط کر دیا۔ دیہات میں مالکن بڑی باختیار عورت ہوتی ہے۔ دکن کے دیہات میں یہ ”کاروبارنی“ کہلاتی ہے اور چودھری کے لیے کاروباری استعمال کرتے ہیں۔ رام پیاری کو جب یہ عہدہ ملا تو اس نے اپنے خسر اور دیور اور دیورانی (جو اس کی حقیقی بہن بھی تھی) کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن پیسے کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہی۔ چھوٹی بہن کو خسر کے انتقال کے بعد احساس کمتری نے ورغلا یا اور وہ میاں بیوی مع اپنے بچوں کے تلاش معیشت میں کلکتہ روانہ ہوئے اور رام پیاری جان چھڑالی

وہ اکیلی رہ گئی اور زراعتی کاروبار کے لیے اس کو کافی فرصت ملنے لگی۔ اس کا ملازم جو کھو بن بیابا تھا۔ رام پیاری اکثر اس سے شادی کرنے کو کہتی اور جو کھو ٹال جاتا۔ آخر جب اُس نے زیادہ مجبور کیا تو جو کھو نے کہا۔

”اچھا تو سنو میں چاہتا ہوں کہ وہ (میری دلہن) تمہاری طرح ہو ایسی ہی بھانے والی ہو ایسی ہی بات چیت میں ہو شیار ہو ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو ایسی ہی کفایت شعار ہو ایسی ہی ہنس کھنکھو۔ بس ایسی عورت ملیگی تو بیاہ کروں گا نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔“ پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا پیچھے ہٹ کر بولی تم بڑے دلگی باج ہو ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ گئے۔ ان الفاظ پر افسانہ ختم ہو گیا ہے اور پریم چند نے باتوں باتوں میں اپنے مطلب کی بات بھی بیان کر دی ہے۔

”نئی بیوی“ (داروات) میں پریم چند نے بے جوڑ شادیوں کے نتائج کا انہار کیا ہے ان شادیوں میں عورت بوڑھے شوہر سے محبت نہیں کر سکتی وہ ہمدردی کر سکتی ہے۔ بیٹی کی طرح چاہ سکتی ہے یا ملازمہ کی طرح خدمت کر سکتی ہے مگر بیوی بن کر اپنے شوہر سے محبت نہیں کر سکتی۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور پریم چند کی تصویریں بے حد رنگین اور دلادیز ہیں۔

حاکموں کا کردار | پریم چند نے اپنے افسانوں میں عہدہ داروں اور ماتحتوں کے کردار کا بھی نقشہ نہایت صحیح انداز میں کھینچا ہے۔ مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا۔ حاکم اور محکوم دونوں کے ذہنی تفاوت کی مثالیں پریم چند کے افسانوں میں دن کی طرح روشن ہیں۔ حاکم کی فرعونیت اور بددماغی کے ایسے ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ اس کے انسان ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔ بعض وقت ہمیں دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ افسانہ ہی تو ہے، جو کچھ لکھیں تھوڑا ہے لیکن پریم چند کے کرداروں جیسے فرعون بے سامان حاکموں کی بھی دنیا میں کی نہیں جنہیں ملازمت کا دُور سے بھی واسطہ ہے وہ ان کی فرعونیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔

”استغنی“ (پریم چالیسی اول) میں ایک حاکم اور ایک محکوم کے کردار کو ٹاپا کر کیا گیا ہے۔ فتح چند دفتر میں کلرک تھے۔ صبح کے گئے شام کو لوٹے کہ پھر چیراوسی نے آکر دستک دی اور کچھ دنگا

صاحب نے بلایا ہے یہ بیگلے پر پہنچے، صاحب غصہ میں بھرے ہوئے نشہ کی حالت میں بیٹھے تھے، فتح چند کو دیکھتے ہی کچھ مغلظات سنائیں اور چہرہ اسی سے ان کا کان پکڑنے کو کہا۔ مگر وہ صاف انکار کر گیا۔

”صاحب اب غصہ ضبط نہ کر سکے ہنٹر لے کر دوڑے چہرہ اسی نے دیکھا، یہاں کھڑے رہنے میں خیریت نہیں ہے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ فتح چند ابھی تک بے حس و حرکت کھڑے تھے، صاحب نے چہرہ اسی کو نہ پایا تو ان کے پاس آئے ان کے کان پکڑ کر زور سے ہلا دیے اور کہا ”تم سورا“

گستاکی کرتے جا کر آفس سے فائل لاؤ۔ فتح چند نے کہا کونسا فائل لاؤں حضور۔

صاحب - فائل فائل اور کونسا فائل تم بہرا ہے سنتا ہے ہم فائل مانگتا ہے۔

فتح چند نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا ”وآپ کو کونسا فائل مانگتے ہیں؟“

صاحب - وہی فائل جو ہم مانگتا ہے وہی فائل لاؤ ابھی لاؤ۔

یہ ہے حاکم و محکوم کی گفتگو دونوں ایک ہی حکومت کا دیا کھاتے ہیں دونوں ایک ہی حکومت کے غلام ہیں اور دونوں پر ایک ہی قانون چلتا ہے مگر فرق صرف حاکم و محکوم کا ہے۔ حاکم سمجھتا ہے کہ اس کا محکوم اس کا زرخیز غلام ہے اور یہ ہندوستان کے نئے فیصد حاکموں کا نقشہ ہے۔

ایک جگہ پولیس والوں کے کردار کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں۔

”یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ۔ لپ۔ بچام بچو۔

نوری نے تصحیح کی۔ کیا کہا یہ پولیس والے پہرہ دینے میں، جب ہی تمہیں بہت خبر

ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے

ٹلے رہتے ہیں رات کو یہ سب ایک محلہ میں تو چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو اور دوسرے

محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو جاگتے رہو۔ (عمید گاہ - دودھ کی قیمت)

پولیس اور رعایا دونوں میں حاکم و محکوم کا تعلق ہے۔ اور پریم چند نے اکثر مقامات پر پولیس والوں کے راز بے نقاب کیے ہیں۔ ”(عین) میں بھی جا بجا لطیف اشارے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسی

بات ہو جو ان سے فرو گذاشت ہو گئی ہو۔ اپنے ایک افسانے میں انھوں نے واروغبجی کا خاکہ کھینچا ہے۔

”واروغبجی نہایت کارگزار افسر تھے گالیوں سے بات کرتے تھے۔ صبح کو چارپائی سے

اٹھتے ہی گالیوں کا وظیفہ پڑھتے (دورے کے سلسلے میں وہ ایک گاؤں میں پہنچے)

سارے گاؤں میں بلبل پڑ گئی تھی کانسٹبل اور چوکیدار راستوں پر یوں اگڑتے چلتے تھے گویا

اپنی سسرال میں آئے ہیں“ (اندھیر - پچھلی دوم)

رشتوت ستانی | اگر ہم ان واقعات کا غائر مطالعہ کریں تو اس میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی

نظر آئے گی ان واقعات کے ساتھ ہمیں عہدہ داروں کی رشتوت ستانی کا خیال آتا ہے۔ اور

دست غیب سے جو حق تلفی اور نا انصافی ہوتی ہے اس کی پول کھلتی ہے۔ ادھر پریم چند ملازم

ہوئے اور انھیں ملازمین سرکار کے کردار کا اندازہ ہونے لگا۔ وہ خود تو بیچارے تعلیمات میں تھے

کچھ زیادہ پتہ بھی نہ چلنا مگر ”سوز وطن“ کی اشاعت نے انھیں بری طرح پھینسا دیا اور مختلف

عہدہ داروں سے سابقہ پڑا اس میں پولیس کے لوگ بھی تھے اور مالگزاروں کے بھی تعلیمات

کے بھی تھے اور نظم و نسق (سیاسیات) کے بھی اس سے ان کی نظریں وسیع ہو گئیں۔ وہ رشتوت

کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ممکن ہے کہ ان پر انگور کھٹے ہیں والی مثل صادق آئی

ہو مگر ان کے خیالات اتنے پاکیزہ ہیں کہ دل پر اثر کرتے ہیں وہ اس کا واحد حل یہ بتاتے

ہیں کہ ”جب تک چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہو جائے گی کہ وہ بھل منسی کے ساتھ نباہ

کر سکیں تب تک رشتوت بند نہیں ہو سکتی۔ تنخواہ بڑھنے کے بعد شاید غریب رشتوت لینا بند

کر دے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ رشتوت کیسے بند ہوگی جو بڑی تنخواہوں والے مختلف طریقوں

سے اپنے نام اور تنخواہ کے تناسب کا لحاظ کرتے ہوئے لیتے ہیں۔ ان کا ایقان تھا کہ

مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی اور اس بنیاد پر انھوں نے اپنا ایک افسانہ بھی لکھا کیا

اور یہی افسانہ بڑھتے بڑھتے ”بازار حسن“ بن گیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

”پیٹت کرشن چندر نے رشوت لی مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ مالِ حرام تنہا مشکل سے ہضم ہوتا ہے مختار نے سارا بھانڈا بھوڑ دیا اور خفیہ طور پر تحقیقات بھی ہو گئی اور عین لڑکی کی شادی کی رسموں کے آغاز کے وقت پرنٹنڈنٹ کی کانسٹیبلوں کے ساتھ آئے ایک سب انسپکٹر نے جیب سے گرفتاری کا وارنٹ نکال کر کرشن چندر کو دکھایا ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ایک سکتے کی حالت میں سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرہ پر خون نہ تھا۔ ندامت تھی۔ یہ وہی دونوں سب انسپکٹر تھے جن کے سامنے وہ غرور سے گردن اٹھا کر چلتے تھے جنہیں وہ حقیر سمجھتے تھے۔ ساری عمر کی نیک نامی خاک میں مل گئی نفس نے کہا اب اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھاؤ مین نہ کہتا تھا کہ آگ میں نہ کو دو تم نے میرا کہا نہ مانا اگر تم نے کسی معمولی خاندان میں شادی کرنے پر قناعت کی جوتی تو آج یہ نوبت کیوں آتی مگر تمہیں اپنی عزت اور وقار کی بڑی تھی تو اب اس سودائے خام کا مزہ چکھو۔“

بریم چند نے اس سودائے خام کا مزہ بڑی بڑی طرح چکھایا۔ قصہ کی اصل بنیاد یہی ہے کہ پیٹت کرشن چندر نے اپنی لڑکی کو زیادہ ہمیز دینے کی خاطر صرف ایک دفعہ گرانقدر رشوت لی اور اس کو بچا نہ سکے۔ اس کے بعد انھیں برسوں جیل میں رہنا پڑا اور پھر لڑکیوں کی جو درگت بنی وہ الگ۔

ان کا ناول (غبن) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے وہاں نئی بیوی کے لیے زیور بنانے کی خواہش نے اُما کو زیادہ سے زیادہ رشوت لینے پر مجبور کیا، پھر غبن کا بے بنیاد الزام اپنے سر لے کر کلکتہ بھاگ کھڑا ہوا اور دیسی دین کے گھر میں پناہ لی۔ لیکن ناول کے آخری حصہ میں اُما کی بیوی کی زبان سے وہ کہلاتے ہیں۔

”یہ نہیں کہتی کہ عیش آرام سے میرا جی بھر گیا یا کہنے پڑے میں اوپ گئی یا سیر تاشے سے مجھ
نفرت ہے۔ یہ ساری تمنائیں جوں کی توں ہیں اگر تم اپنی قوت بازو سے، اپنی جانفشانی
سے انھیں پورا کر سکو تو کیا کہنا، لیکن نیت کھوٹی کر کے یا ضمیر کا خون کر کے ایک لاکھ بھی لاؤ
تو میں اسے ٹھکرا دوں گی۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند نے عورتوں کو زیادہ نیک نفس بتایا ہے اور مردوں کو جلیس۔
”دنک کا داروہ“ (پریم چند کی پہلی ادب) ان کا وہ افسانہ ہے جس کو وہ اپنے بہترین افسانوں
میں شامل کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد بھی رشوت پر ہے۔ داروہ کے والد نے اپنے بیٹے ہنسی دھر کو تلاش
ملازمت کے لیے جاتے وقت سمجھایا۔

”ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمدنی ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنا شی کا پٹا
ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹے گھٹے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم
بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لیے
اس میں برکت نہیں ہوتی اور تم خود عالم و فاضل ہو تمہیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ
ضمیر اور قیامت کی پہچان پر منحصر ہے۔“

ہنسی دھر تک کے داروہ بن گئے اور جب سیٹھ الوپی دین کی گاڑیاں بغیر حصول ادا کیے
جانے لگیں تو گرفتار کر لیا۔

”پینڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا عملی تجربہ تھا، وہ کہا کرتے
تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا، دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے اور ان کا یہ قول بہت
صحیح تھا، قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت
اپنا جی بھلایا کرتی ہے۔“

مگر الوبی دین کو بنسی دھر کی دیانت سے نیچا دکھایا۔ انھوں نے حق و صداقت کو نہ چھوڑا اور چونکہ حق تلخ ہے، اس لیے انھیں حق کہہ کر معطل ہونا پڑا۔ لیکن اسی ساج گواہی نے جب الوبی دین کو تختہ کل کی تلاش ہوئی تو ان کی نگاہ انتخاب بنسی دھر ہی پر پڑی۔

”مشعل ہدایت“ (پریم تپسی دوم) دیہاتی افسانوں میں ان کا بہترین افسانہ ہے، مگر اس میں بھی رشوت کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ سے دیہاتیوں کی پریشانی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ داروغہ ذوالفقار علی خاں کا یہ کہنا کہ۔

”دیوبلیس کے محکمے میں جو رشوت نہیں لیتا اسے میں احمق سمجھتا ہوں۔ میں نے دو ایک سربلنگٹ دیکھے ہیں، لیکن ہمیشہ تباہ، کبھی معتوب، کبھی معطل، کبھی برخواست“

محکمہ دیوبلیس پر بڑی چوٹ ہے اور صداقت پر مبنی ہے۔ اور بھی کئی افسانے ہیں جن میں رشوت ستانی کے مصائب اور حاکموں کی چہرہ دہتیوں کو جھٹتے ہوئے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

دیہاتیوں کا کردار | ہم امیروں اور حاکموں کے کردار کا اندازہ تو کر چکے اب دیہاتیوں کے کردار بھی دیکھیں گے۔ (پریم چالیسی) میں ان کا ایک اچھا افسانہ (منتر) ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

”شام کا وقت ہے۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی، کہ دو کپار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نجیف آدمی لاٹھی ٹٹکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی رطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازے پر آکر اندر جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر اسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلانا دے۔

ڈاکٹر صاحب نے جتن کے اندر سے گرج کر کہا ”کون ہے کیا چاہتا ہے؟“

بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا ”ہجور گریب آدمی ہوں میرا لاکا کئی دن سے.....“

..... ڈاکٹر نے سکار جلاتے ہوئے کہا ”کل سویرے آؤ سویرے۔“

آخر ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور بوڑھے کی منتیں صدا بصر اٹا بت ہوئیں۔ بوڑھے کا پیا لہجہ

الند کو بیباک رہا۔ بوڑھا جھگٹ تھا۔ سانپوں کے ڈسے اس سے شفا پاتے تھے اور دور دور تک اس کی شہرت تھی۔ اتفاق کہیے کہ ڈاکٹر چڈھا کے عزیز بیٹے کا مشغذ بھی سانپوں کو کچلنا اور پالنا تھا۔ وہ پالتو سانپوں کو رام تو کر چکا تھا لیکن۔

عاقبت گرگ زاوہ گرگ شود

کے بمصداق ایک کالے ناگ نے عین تقریب کے موقع پر اس کو ڈس لیا۔ یہ اطلاع رفتہ رفتہ بھگت تک پہنچ گئی۔ اس کے ضمیر اور نفس میں کشمکش پیدا ہو گئی اور اس نے نفس کا مطیع ہو کر۔

”کو اڑنگا دیسے اور پھرا کر بیٹھا۔ مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو

رات کو کسی اجنبی کی آہٹ یا کر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکا نہیں جھوٹا۔ زور سے

چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت

کیساتھ روک رہا تھا، پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے

پتے کی طرح اس بد نصیب نوجوان کی طرف اٹرا ہوا جا رہا تھا، جو اس وقت مر رہا تھا

اور جس کے لیے ایک لمحہ کی دیر باز یافت کے امکان کو اور ٹال رہی تھی۔“

آخر بھگت نے اپنی ضمیر کی آواز کو جو نثار خانہ میں طوطی کی طرح تھی سن لیا اور آہستہ سے کو اڑکھولے کو اڑکی آواز سے بڑھیا جاگ پڑی اور ٹوکنے لگی کہ تم بھرو وہیں چلے۔ بھگت نے کہا۔

”میں وہاں سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ ذرا دیکھوں گا لوگ کیا کرتے

ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا بیٹنا دیکھوں گا۔ کس طرح سر پیٹتے ہیں، کس طرح چھپا میں

کھاتے ہیں، ذرا دیکھوں گا، بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر جاتے

ہیں۔ وہ لوگ تو دوڑوان ہوتے ہیں، سن میں سمجھ کر رہ جاتے ہوں گے۔“

بڑھیا کو اس انداز میں سمجھا کر اس نے بنگلے کی راہ لی اور انتان و خیزاں وہاں پہنچ کر ڈاکٹر چڈھا

کی زندگی کے سہارے کو بچا لیا۔ بھگت اور اس کی بیوی کا تو ایقان یہ تھا کہ ان کا لال محض

ڈاکٹر کی لایروائی کی نذر ہو گیا ہے ورنہ وہ ابھی نہ مرتا۔ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے

دشمن تھے، لیکن عموماً دیہاتی کسی کی موت کے وقت دشمنی اور دوستی کو بھول کر اس کی موت مٹی میں شریک ہو جاتے ہیں اگر بچانے کا موقع ہو تو اس کی بھی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ مرنے والے کی یادیں جو آنسو بہائے جاتے ہیں ان سے سارے داغ دھل جاتے ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی بہت اہم خصوصیت ہے اور اس کی وضاحت منشی جی نے بڑی خوبی سے کی ہے۔

روشنی (واردات) میں وہ ایک دیہاتی بیوہ کا ایک ایسا بلند کردار پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی عورت کی تفسیر اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک راجکمار شکار کرتے ہوئے راستہ گم کر چکے ہیں اور ایک طوفان میں گھر گئے ہیں۔ اس اثناء میں ایک عورت اپنے گلوں کو نہایت تیزی سے جاتی ہے، راستہ میں راجکمار سے ملتی ہے اور ان کی رہبر بن جاتی ہے اور راستہ چلتے ہوئے راجکمار کے استفسار پر یہ بیان دیتی ہے۔

”ابھی تو کل چمہ مہینے ہوئے بابو جی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیاتے ہوئی، بس آنکھیں بند ہو گئیں.....
تب سے بابو جی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں.....“

”اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آبدیدہ ہو گیا اور جب سے پانچ روپے نکالی اس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”میرے طرف سے یہ بچوں کی منگھائی کھانے کے لیے لو۔
مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا۔“

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی ”نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجئے۔ میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں ہوں۔“

”یہ بھیک نہیں ہے۔ بچوں کی منگھائی کھانے کے لیے ہے۔“
”نہیں بابو جی۔“

”مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔“

”نہیں بابو جی اس بیواہ کو اسکی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں۔“

اس فرض تناسی اور خودداری کی مثال ایسی غریب طبقہ کی معمولی عورت میں باید و شاید نظر آتی ہے مگر دیہات میں یہ چیز عام ہے اور شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہوگی۔ ہماری شہری تہذیب اور دیہاتی تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دیہاتی انسانوں کا کردار میں فرشتہ پن زیادہ ہے اور شہری انسان اپنی اس تہذیب میں مرا جا رہا ہے جو اپنے خیر سے آپ ہی خودکشی کر رہی ہے۔ وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے اور مہذب کہلانے کے بھی ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ منشی پریم چند نے اسی سلسلے میں لکھا ہے ”اگر تعلیم فی الحاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے“

”بے غرض محض“ پریم چند کا بہت مشہور افسانہ ہے جس میں ”مشعل ہدایت“ کی طرح دیہات کے متعلق بہت کچھ تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔ لیکن تخت سنگھ اور اس کی بیوی کا کردار نہایت بلند ریوتی رانی کے بیٹے نے تخت سنگھ پر بہت سے مظالم توڑے۔ اور اب تخت سنگھ بیمار ہے یہہ اطلاع ریوتی رانی کو ملی اور وہ مدد کرنے کے لیے روپیوں کی پوٹلی لے آئی۔ روپیوں کی جھنکار سن کر اٹھ بیٹھا۔ رانی ہم اس کے بھوکے نہیں ہے مرتے دم گہنکار نہ کرو۔ اسی کی بیوی جب اُپلے بیج کر بیوگی کے دن گزارنے لگی، تو ریوتی رانی نے ایک دن اصل قیمت سے زائد پیسے دیدیے۔ اُس دن سے ٹھکراؤں نے اس کے یہاں اُپلے لانا بند کر دیا۔

یہ بلند کرداری پریم چند کے ہر دیہاتی ماحول سے متعلق افسانے میں ملے گی کوئی افسانہ ان بلند یوں سے خالی نظر نہیں آتا۔ ”بانکا زمیندار“ (پریم چیمسی دھم) بھی ہے تو اس کو بانکے دیہاتی مل جاتے ہیں اور زمیندار کا بانکین بھلا دیتے ہیں۔ ”مشعل ہدایت“ میں دیہاتیوں کی اپنے زمینداروں کے ساتھ وفاداریاں اور ان کی سادگیاں عیاں ہیں۔ انھیں مختار کس طرح پریشان کرتا ہے۔ پولیس کے ہاتھوں میں وہ کیسے گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ سب مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں اور دل ہلا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں لیڈروں کے عادات و خصائل بھی معلوم ہوتے ہیں اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے

قول اور فعل میں کس قدر تضاد ہے۔

پریم ہتیبی اول میں ایک افسانہ (قربانی) ہے اس میں گردھاری کی تصویر جس انداز سے کھینچی گئی ہے اس کی تعریف نہیں کیجا سکتی۔ ایک کسان اپنے کھیتوں اور اپنے زرعی آلات ہی کو اپنی زندگی سمجھتا ہے۔ جب یہ چیزیں چھین جاتی ہیں تو زندگی اس کے لیے اجیرن ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل تو ہو جاتا ہے لیکن اس کے کھسیت میں ہل چلانے والوں کو نظر آتا رہتا ہے۔ پریم چند نے ان چیزوں پر بہت زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر ان چیزوں پر بہت گہری تھی۔ اگر وہ کسان کے متعلق لکھتے ہیں تو قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ لکھنے والا ممکن ہے کہ کسان ہو۔ اگر وہ زمیندار کا خاکہ کھینچتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمیندار ہی ہوں گے، جب ہی تو ان جزئیات سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی ایک ادیب کا کمال ہے کہ خود بھی اس میں جذب ہو جائے اور پڑھنے والے کو بھی جذب کر لے۔ پریم چند مدرس تمھے لیکن انھوں نے کوئی محکمہ یا طبقہ ایسا نہیں چھوڑا جس کی جزئیات کو نہ بیان کیا ہو۔

بچوں کی نفسیات | جس طرح پریم چند نے شہریوں - دیہاتیوں - حاکم و محکوم اور بڑی عمر کے آدمیوں کی کردار نگاری میں کمال دکھایا ہے اسی طرح وہ بچوں کی نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بچوں ہی میں بسر ہوا کیوں بھی ہر شخص ان کی نفسیات سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوتا ہے، مگر پریم چند نے جہاں دوسرے کرداروں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے، اسی طرح بچوں کی حرکتوں کو بھی ظاہر کیا ہے۔ ان کے اکثر افسانے ایسے ہیں، جن میں کردار پیدا ہو کر پروان چڑھ گئے ہیں۔ گلی ڈنڈا (واردات) چوری اور قزاقی (پریم چالیسی اول) اسی قبیل کے افسانے ہیں۔

خود نوشت سوانح افسانوں میں | انھوں نے اکثر مقامات پر اپنے افسانوں میں اپنی زندگی کے حالات بھی سو دیے ہیں اور اس طرح ان کا ادب ان کی زندگی کا آئینہ بن گیا ہے۔ ان کے والد کا

تعلق سررشتہ ٹپہ سے تھا۔ ”قزاقی“ میں انہوں نے اس تعلق کو نہایت وضاحت کے ساتھ بتلایا ہے۔ قزاقی ایک ہرکارے کا نام ہے، جو مٹھی ٹپہ کے بچے سے بڑی الفت اور انس سے پیش آتا ہے۔ اس احساس کے متعلق وہ یوں بیان دیتے ہیں۔ ”میرا دل فطرت سے زیادہ اچھلنے لگتا خوشی کی امنگ میں ہن بھی دوڑ جاتا، اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا نکلھنا سن جاتا۔ وہ مقام میری تنوں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہو گا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا“

اس کے بعد قزاقی کی برطرفی اور اس پر بچہ کا گریہ و زاری کرنا، پیسہ جمع کرنے کی ہوس، اور اس کے احساس پر خوشی۔ بڑے ہونے کے بعد اس عادت کا تبدیل ہو جانا، یہ سب چیزیں بچوں کی نفسیاتی کیفیتوں اور پریم چند کی زندگی پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

لال فینتہ (خواب خیال) ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

”ذہانت کسی طبقہ کی میراث اور کسی اصول وراثت کی مطیع نہیں۔ مسٹر ہری بلاس اس کی مجسم دلیل تھے۔ کیا معلوم تھا کہ منشی ٹپہ کا بیٹا بھی کسی معمولی خدمت پر رہنے کی بجائے ہندوستان میں چوٹی کا اویس بن جائے گا۔ اس کے بعد اور بھی کئی ایسے واقعات اس افسانے میں موجود ہیں جو پریم چند کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”مگر ہری بلاس کا شوق طلب اس گرمی اور سردی سے مستغنی تھا اس عزم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار طلبہ کا مایہ امتیاز ہے۔ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ وہ ایک رئیس کے لڑکے کو پڑھا کر تعلیمی مصارف نکال لیا کرتا تھا مگر وقتاً فوقتاً اسے ایک مشنت روپیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر یہاں ہم ہری بلاس کی جگہ پریم چند کا نام رکھ دیں تو یہ سارے واقعات صحیح ہو جاتے ہیں اور افسانہ حقیقت بن جاتا ہے۔

ڈیپانسٹریشن (نجات) میں وہ لکھتے ہیں۔ ”ہر ایک کمپنی کا ایک ڈرامہ نویس بھی ہوتا ہے۔ بھلا وہ کب گوارا کرے گا کہ اس کمپنی میں غیر شخص کا داخلہ ہو۔ وہ اس تصنیف میں طرح طرح کے

عیب نکالے گا، اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دیگا۔ یہ پریم چند کا ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکثر جگہ انھوں نے اس کی طرف جستہ جستہ اشارے کیے ہیں۔ ادیب کی عزت (نجات) میں جب قمر کی بیوی نے اس کو اپنی صحت قائم رکھنے کے لیے سیر و تفریح کو ضروری قرار دیا تو اس نے جواب دیا۔

”میں تو مل کا مزدور ہوں تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے۔ جنھیں کھانے کی کمی نہیں، انھیں ہوا کی ضرورت ہے۔ جنھیں روٹیوں کے لالے ہیں، وہ جو اکیا کھائیں گے۔ پیرتندرستی اور لمبی عمر کی بھی انھیں کو ضرورت ہے، جن کو زندگی کے عیش و آرام میسر ہیں۔ میرے لیے تو زندگی محض بار ہے۔ اس بار کو اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھ میں نہیں..... جیراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے کوئی مطلب نہیں..... ادبی خدمت اور فرہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب مولانا تازہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں۔ لوج نہیں۔ جیراغ کا کام جلنا ہے جیراغ وہی لبالب بھرا ہو گا جو جلا نہیں۔“

کچھ تعجب ہے کہ یہ الفاظ انھوں نے شیورانی دیوی سے کہے ہوں اور اسی پر ایک افسانہ کھڑا کر دیا ہو۔ ان افسانوں کے علاوہ جیل (نجات) توبہ نامیہ تفریح (خواب خیالی) اور استعفی (پریم چالیسی اول) میں انھوں نے اپنی زندگی پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

سُور کا مرتبہ اور آزادی عورت کے متعلق پریم چند کے خیالات بہت اعلیٰ و ارفع تھے۔ وہ عورت کی آزادی کو بہت پسند کرتے تھے۔ ہندوؤں کے رسم و رواج نے عورت کو جس بُری طرح کچل ڈالا ہے، اس سے وہ سخت متنفر تھے۔ ان کے تقریباً نصف سے زیادہ افسانے عورت کی ہستی کو بلند و برتر اور قابل تحرم و تکریم بتلاتے ہیں۔ اس کے اعتقادات، اس کا ایثار، اس کی محبت اور اس میں مصائب برداشت کرنے کی قابلیت، خودواری، شوہر پرستی، اور مذہب کی

پابندی کا خیال اس کے خمیر میں ہے، اور اس کی تکمیل کے لیے وہ اپنی جان کی کبھی پروا نہیں کرتی۔ جب وہ ایک سے محبت کرتی ہے تو ہمیشہ اسی کو چاہتی ہے، خواہ اس کا جسم کسی اور کے حوالے ہو جائے۔ اس کی روح اس سے بے تعلق نہیں ہو سکتی جس کو اس نے اپنا بیتی تسلیم کر لیا ہے۔ ان تمام اوصاف کے مد نظر وہ قابل احترام ہستی بن گئی ہے۔ اسی لیے وہ ان تمام مراعات کی مستحق ہے، جس سے زمانے نے اس کو محروم کر رکھا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانے ”وکسم“ (دودھ کی قیمت) میں اس کو آزادی نہ دینے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”مرد کو اگر اطاعت کی آزادی ہے تو عورت کو آزادی کیوں نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادمانی نے ایک عورت کو فلام بنا دیا ہے وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے کوئی اس سے باز پرس نہیں..... وہ جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اُسے رورود کر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں اینٹ سے بھی ہندیں محض تھپڑ سے دے سکتی ہے، تو اسے کبھی بد مزاجی کی جرات نہ ہوتی“

باز یافت (بہنسی دوم) میں عورت کے متعلق لکھتے ہیں۔

”عورت محض بچے جننے، شوہر کی خدمت کرنے، اور ایک کاوشی کا برت رکھنے کے لیے نہیں ہے اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ و بلند ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی اور ذہنی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔ وہ انسانی آزادی کی سادی حق دار ہے“

غرض اس طرح انہوں نے اپنے اس خیال کی تائید کی ہے، اور عورت کو نہ صرف اس طرح قابل احترام ہستی بتلایا ہے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ عورت مرد کی زندگی کو چاہے تو بنا سکتی ہے اور چاہے تو بگاڑ سکتی ہے۔ لیکن ہندوستانی عورت کا زیادہ تر یہ مطمح نظر رہا ہے کہ اپنے شوہر کی زندگی کو بنائے اسی خیال کے تحت پریم چند نے لکھا ہے۔

”دیکھیں ہم دونوں برگیں کی کتھما کنارے لٹتی ہے۔ تم اپنی دیسی پانچزار برس کی بوسیدہ و تمیم کشتی پر بیٹھی ہو، میں تیز رفتا رموٹر بوٹ پر۔ موقع، کوشش اور سائنس تمام میرے ساتھ ہیں، لیکن، اگر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو میں اسی رموٹر بوٹ پر ڈوبوں گی۔ سال میں لاکھوں آدمی ریل سے کٹ کر مرتے ہیں، مگر کوئی بیل، گاڑی پر سفر نہیں کرتا۔ ریل کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔“

ہماری معاشرت نمود و نمائش سے بھری ہوئی ہے۔ ہم صورت دیکھتے ہیں، لیکن سیرت دیکھنے کا ہمیں موقع نہیں ملتا۔ ظاہری حالات ہمیں زیادہ فریفتہ کرتے ہیں، اور اندرونی حالات تک ہماری کوتاہ نظری پہنچنے کا موقع نہیں دیتی۔ چنانچہ انہیں چیزوں نے پیدا کوڈوڈ گر دیدہ بنا دیا اور ونوڈو کو پیدا کیا۔ اس ظاہری حالت اور محبت میں ناکامی پر تنقید کرتے ہوئے چند رائے لکھا۔

”سوانگ، آوارہ مزاج نورتوں کے بیٹے ہے۔ گھر طوع و برہن میں تو محبت کا خزانہ اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔ زیور کپڑے، سینے بولنے میں مست، رہنے والے لوگ نا اہل ہوتے ہیں۔ اپنی نا اہلیت کو چھپانے کے لیے یہ سوانگ جہنم میں۔ کتے کو خاموش رکھنے کے لیے اس کے سامنے ہڈی کے ٹکڑے پھینکتے ہیں۔ بیجاری عورتیں اپنا سب کچھ دے کر کھلونے باقی ہیں، اور انہیں میں مست رہتی ہیں۔ بالائے سطح پلبلے تیرتے ہیں۔ موتی سمندر کی تہ میں رہتے ہیں۔“

اس طرح پریم چند نے عورت کو سمندر کی تہ میں رہنے والے موتی سے تشبیہ دی ہے۔ وہ عورت کو اتنی طاقتور بتلاتے ہیں، کہ غیر معمولی حالات میں جہاں مرد کی بھی جرأت جواب دے جاتی ہے، وہاں عورت استقلال کے ساتھ قدم جمائے کھڑی رہتی ہے۔ خواب پریشان (بتیسی دیم) میں وہ اس طرح وقم طراز ہیں۔

کنور امرتا تھ۔ وہاں آسمانوں کی چیزیں نایاب ہوں گی دزدوں کا خوف ہوگا۔

منورما — لیکن تم بھی ان تکلیفوں کی عادی نہیں ہو۔
 کنور — میں مرد ہوں انہیں باسانی برداشت کر سکتا ہوں۔
 منورما — میں موقع اور ضرورت پر آگ میں کود سکتی ہوں عورتوں کی نزاکت مرد کا
 تخیل ہے، انہیں نازک کہکر زبردستی نازک بنایا جاتا ہے۔ ان کا جسم کمزور
 ہوتا ہے، پردل، ارادہ اور سمہت کا وہ بانہہ ہے جس پر زمانہ کے حادثات
 کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔

راجپوتوں کی عظمت | اس ارادہ اور بانہہ کی مثالیں ہم ان افسانوں میں دیکھتے ہیں جنہیں راجپوتوں
 کی معاشرت، ان کا تمدن، ان کی تہذیب، ان کی جراتیں اور ان کے حوصلوں کو نظر کیا گیا ہے۔
 راجپوت کی جنگی قابلیتیں تاریخ جاننے والوں سے مخفی نہیں۔ یہی ایک قوم ہے، جو منظم رہ کر جنگ
 میں حصہ لیتی تھی، اور اسی قوم کے سوراؤں نے باہر سے آنے والی ذہنوں کا مقابلہ کیا، اور
 ہندوستان کو غیر کے ماتحتوں میں جانے سے بچانے کی تادم مرگ کوشش کی۔ ان میں اکثر راجہ
 اور رانیاں رستم و اسفندیار اور افراسیاب و جمشید کی طرح راجپوتوں کی قومی کہانیوں میں
 داخل ہو گئے ہیں۔ راجہ ہرودل اور رانی سارندھانے اس سلسلے میں لازوال شہرت حاصل کر لی
 ہے۔ پریم چند نے ان کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان کے مطالعے کے بعد ان کی عظمت و
 جبروت اور ان کے تقدس کا سکہ ہمارے دلوں پر میٹھا جاتا ہے۔

”دکرات کا تیغ“ (پریم چند کی پہلی اول) میں ہمارا رنجیت سنگھ کے دور کی ایک کہانی ہے۔
 اس میں ہرندا ایک بیوہ عورت ہے اور اپنی دل بہلائی کے لیے گنگائی ہوئی گھر کے کام کاج
 کرتی ہے۔ ہمارا ناکے زوجی سن پاتے ہیں۔ اور جبراً اس کو اپنے پڑاؤ پر لیا کر اس کا گانا سننے میں۔
 وہ انتقام کی خاطر ہمارا ناکے دربار میں پہنچتی ہے اور اس کے سامنے اپنا قصہ بیان کرتی ہے۔
 ”میں یہ عورت ہوں میری عزت کے پاسان آپ ہیں۔ پتی بیوگ کے ساڑھے تین ماہ
 میں لے تپسوتی بن کر کاٹے تھے۔ مگر آپ کے آدمیوں نے میری تپسیا خاک میں ملا دی۔

میں اس قابل نہیں کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں۔ اپنے بچے کے لیے میری گود اب نہیں طعنی۔ اپنے بوڑھے باپ کے سامنے میری گردن نہیں اٹھتی۔ میں اب اپنے گاؤں کی عورتوں سے آنکھیں جراتی ہوں۔ میری عزت لٹ گئی۔ عورت کی عزت کتنی قیمتی چیز ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ ایک عورت کی عزت کے پیچھے لنگا کا شاندار راج مدے گیا۔ ایک ہی عورت کی عزت کے لیے کروڑوں کا ناس ہو گیا۔ عورتوں کی عزت کے لیے ہمیشہ خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ اور راج لٹ گئے ہیں۔ میری عزت آپ کے آدمیوں نے لی ہے۔ اس کا جواب وہ کون سے انصاف کس کا خون چاہتا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کریں۔

بڑی کا پیرہ سرخ ہو گیا۔ ہمارا نا زنجیت سنگھ ایک دہقان عورت کا یہ حوصلہ، یہ خیال اور یہ جوش قدر پر دیکھ کر سناٹے میں آگئے۔ کالج کا بکڑا ٹوٹ کر تیز دھار والا چھرا ہو جاتا ہے، وہی کیفیت انسان کے ٹوٹے دل کی ہے۔

غریب راجپوتھی کے یہ الفاظ ہمارا نا کو سکتے میں ڈال گئے اور اس کے دل پر بھی عورت کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اسی طرح رانی سارندھا کے الفاظ کی شان اور سطوت و شوکت ان نغوظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

عالمگیر کے ایک امیر ولی بہادر خاں نے رانی سارندھا کے بچے کا گھوڑا چھین لیا، اور رانی اس کو لینے کے لیے اپنی فوج کے ساتھ عالمگیر کے دربار میں پہنچی جہاں امیر موجود تھا۔ خان صاحب اور رانی میں سواں جواب ہوئے۔ خان صاحب نے دینے میں عذر کیا تو رانی نے کہہ دیا کہ اس کا فیصلہ تلواروں میں کریں گی۔ لیکن عالمگیر نے بیچ بچاؤ کر دیا اور رانی سے کہا کہ اس گھوڑے کو واپس کر دیا جائے گا لیکن اس کی قیمت بہت گراں ہوگی۔

رانی۔ میں ایسا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عالمگیر۔ جاگیر اور منصب مجھا۔

رانی۔ جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔

عالمگیر — اپنا راج بھی۔

رانی — اس کی بھی میرے نزدیک کچھ ہستی نہیں۔

عالمگیر — ایک گھوڑے کے مقابلہ میں۔

رانی — جی نہیں۔ اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔

عالمگیر — وہ کیا ہے۔

رانی — اپنی آن۔

اسی بندیل کھنڈ کی راجھاری نے جب اپنے بھائی انردہ سنگھ کو اپنے ساتھیوں کو کٹوا کر آتے دیکھا اور میدان کا رزار کے واقعات، بیان کرتے سنا تو اس کی تیوری پر بل پڑ گئے، اور غرور کی سرخی سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ ”بھدیا۔ تم نے خاندان کی رسم کھدی۔ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ انردہ سنگھ لوٹ گیا، اور اس کی بیوی سیتلا دیوی ناگن کی طرح بل کھا کر اپنی نند سے کہنے لگی ”رسم اتنی پیاری ہے“

سارندھا۔ ہاں

سیتلا۔ اپنا بتی ہوتا تو کلیجہ میں چھپا کر رکھ لیتی۔

سارندھا۔ نہ، کلیجہ میں خنجر چھو دیتی۔

چنانچہ اس نے وقت آنے پر اپنے ہاتھ سے اپنے بتی کے حکم کی تعمیل میں اس کو قتل کر دیا

اور خود بھی اسی خنجر سے اپنے آپ کو دام زلیست سے چھڑا لیا۔

اس سلسلے میں ”بڑے گھر کی بیٹی“ راجہ رول (پچھلی اہل) راجپوت کی بیٹی۔ دو کارکنوں کی ایک (بتی شرم) ”روٹھی اتنی“ کا نام پڑ

قابل ملاحظہ ہیں۔ ان میں راجپوتوں کے خصال اور کارنامے، نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ بعض افسانے نیم تاریخی

حقیقت رکھتے ہیں۔ راجپوتوں کی عظمت کا اظہار کر نیوالے افسانوں میں عورت کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اس لیے کہ یہی وہ مائیں تھیں جن کے سوتو جنے ہارنے۔ پتہ تھیں ندگی گڈاؤنے اور غلام بنے رہنے میں اپنی بیٹی

سمجھی اور ایک عرصہ دراز تک ہر ذی حاکم آدروں سے مغلوب نہیں ہوئے۔

پانچواں باب - پریم چند کا اسلوب بیان

طرز خط اور طرز بیان کی نقل | ہر شخص کا ایک خاص اور محبوب مصنف ہوتا ہے اسی کی کتابیں زیادہ تر اس کے مطالعہ میں رہتی ہیں اور وہ اسکا فی کوشش کرتا ہے کہ اپنی تحریریں بھی اسی پنج پر آجائیں۔ اس کوشش میں بعض حضرات، ضرورتاً تحریری طرز ہی کی مشق نہیں کرتے بلکہ طرز خط بھی اڑانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ بنگال میں نیگور کے طرز خط کی نقل کی گئی حیدرآباد میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور کے طرز خط کی بھی نقل کی اسی طرح کامیاب کوششیں ہوئیں لیکن طرز خط اور طرز تحریر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ طرز خط کی نقل اڑانے میں کامیاب ہونا جتنا آسان ہے اسلوب بیان میں کامیابی حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ بعض لوگ امرکائی کوشش کرتے ہیں کہ کسی خاص ادیب کے طرز تحریر اور طریق بیان کو استعمال کریں مثلاً مولوی عبدالحق نے حالی کے طرز میں لکھنے کی مشق کی اور اب تک لکھتے چلے آتے ہیں۔ لیکن بعض ناکام بھی ہوتے ہیں بعض اپنے بھی طرز طریق کو چھوڑ کر دوسرے کی روش اختیار کرتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں پھر ان کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ بعض خوش قسمت ادیب جنہیں دنیا میں اپنا نام روشن کرنا اور روشن رکھنا ہوتا ہے کسی ایک ادیب کے اسلوب کا اتباع کرتے ہوئے اپنے لیے ایک الگ راستہ قائم کر لیتے ہیں اور یہ راستہ اگر آسان ہو تو ایسا ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر چلنا اپنے لیے فخر سمجھتی ہیں اور اگر مشکل ہو تو ان کے اعزاز بیان پر واہ واہ تو ہوتی ہے لیکن تقلید نہیں ہوتی۔ ان میں آغا حیدر حسن، نیاز، حسن نظامی اور طارموزی بہت نمایاں ہیں۔

اپنے اسلوب کے متعلق پریم چند کا خیال | پریم چند کا تعلق شاہراہ بنانے والے ادیبوں سے ہے انھوں نے شرر، سرشار اور نیگور کی تصانیف سے اپنا مطالعہ شروع کیا، اور ابتدائی تحریریں میں ان کی

آتا گیا لیکن ایک دو کتابوں کے بعد ہی ان مصنفین سے بہت آگے نکل گئے اور جہاں بس طرز ادا اور طرز تحریر کی ضرورت سمجھی انہوں نے اسی کو استعمال کیا۔ ان کی تحریریں سرشار کے رنگ میں ہیں اور کہیں شہر کے کہیں ٹیگور کے اور کہیں چیٹر جی کے اور یہ تعییر طرز میں اس کی شاہد ہے کہ وہ بذاتہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ وہ قاری کو جس ڈگر پر چلانا چاہتے ہیں، اس کی عنان اور اوی کو اس طرف موڑ دیتے ہیں۔ قاری یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہاں شہر کے رنگ میں ہیں اور یہاں ٹیگور کے رنگ میں انہوں نے موقع اور محل کے لحاظ سے کام کیا۔ خود ان کا بیان ہے کہ۔

”میرے طرز تحریر پر کسی دوسرے مصنف کے اسلوب بیان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا،

لیکن پیدت بس زبان اور ڈاکٹر راجندر ناتھ ٹیگور کا طرز کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے۔“

ابتدائی دور میں سرشار کا اتباع | ہر مصنف خواہ وہ بڑا ادیب ہو یا معمولی افسانہ نگار، ابتدا میں ایک نمونہ اپنے پیش نظر رکھتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ اسی کی طرز تحریر اختیار کرے، لیکن جوں جوں مشق بڑھتی جاتی ہے، اس میں ادبیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ یا تو اپنے محبوب مصنف کا کامیاب تقلد بن جاتا ہے، یا اس کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ پریم چند بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ ہم جب ان کے سب سے پہلے کارنامے ”ہم خراہم تو اب“ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شہر کا کوئی نادل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ان کی ہر فصل آن بان کی منظر نگاری کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور پھر وہ مطلب پر آ جاتے ہیں۔ دوسری کتاب ”حب وطن کے قصے یا سوز وطن دیر درویش“ ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے ذاب رائے کو پریم چند بنایا۔ اس میں افسانوں کی ابتدائی انداز سے ہوئی ہے۔ یہاں شہر کی منظر نگاری تو نہیں، لیکن زبان ویسی ہی فارسی آمیز ہے۔ ان دونوں کتابوں میں زبان کی وہ لطافتیں، روانی، سادگی، لوچ، شگفتگی اور حلاوت نہیں جو آگے چل ان کی تصنیفات کی روح بن گئی ہیں۔ ہن بان میں

قدامت کا رنگ ہے، مثلاً سوز و وطن کی پہلی کہانی ”دنیا کا سب سے انمول رتن“ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

”دلفگار ایک پر نارا درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانناز عشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں، جو عطر پھیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سے سجھو عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں، بلکہ ان سیدھے سادھے بھولے بھالے ندامتوں میں جو گوہ و بیابان میں سر کھولتے اور نادر و فریاد پجاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عشق ہے تو جا، اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ، سب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔“

یاد ہی افسانے کی آخری عبارت کا مطالعہ ان کی ابتدائی طرزِ تحریر کی عکاسی کرنا نظر آتا ہے۔ ”یہ ایک پر وہ زر نگار بیٹ گیا، اور دلفگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ نظر آیا، جس کی ایک نازنین رنگ زلفی تھی۔ دلفریب ابدشان رعنائی مند زین کا روپر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ نظم حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا، اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آ گیا، کہ دلفریب سند سے اٹھی، اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی۔ رقاصانِ دلفوز نے شانے شانے گانے شروع کیے، ہاشیہ نشینانِ دربار نے دلفگار کو ذریعہ گزرا نہیں، اور ماہِ دخور شد کو بہ عزت تمام مسند پر بٹھایا۔“

ہمارے ذہن میں پریم چند کے طرزِ نگارش کے جو نقوش مرتسم ہیں ان میں ان کی تحریروں کا نقش نظر نہیں آتا۔ اس کے لیے ایک علیحدہ جگہ نکالنی پڑتی ہے۔ درختوں ہمارے ذہن ان کو پریم چند کی تحریر سمجھنے سے ابا کرتے ہیں اس لیے کہ اس دور کی تحریریں پریم چند کی فارسی کی استادانہ قابلیت

اور زبان پر اقتدار کا مانہ کی سنلہریں۔ فارسی کے مرکب الفاظ تشبیہیں اور استعارے ہیں (فنا
عجائب) کی یاد دلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کرداروں کے نام بھی ایرانی ہیں۔ لیکن اسی کتاب میں ہمیں
ایسے بھی اشارے ملتے ہیں، جہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اسلوب بیان قایم رہنے والا
نہیں، اور نہ یہ خیالات ہی قایم رہیں گے۔ وہ کسی نہ کسی طرف دھارا کو پھیر دیا گئے۔ یہ کیفیت
ان کے تیسرے افسانے ”یہی میرا وطن ہے“ میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ ساٹھ سال کے بعد
ایک غریب الدیا را اپنے وطن کو واپس آیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

”لیکن میرا گھر، میرا شکتے جھونپڑا، جس کی گودیوں برسوں تک کھیلا تھا، جہاں بچپن اور
بے فکریوں کے مزے لوٹے تھے، جس کا نقشہ، جہی تک آنکھوں میں پھر رہا ہے، وہ اب
ایک تودہ خاکستر ہو گیا تھا۔ مقام غیر آباد نہ تھا، صد با آدمی چلتے پھرتے نظر آئے۔۔۔۔۔
مگر۔۔۔۔۔ ان کے چہروں سے نکل اور پشیمردگی نمایاں تھی، اور وہ سب افکار دنیا
نحت حال معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے سے تو ہی ہریکل، خبشرو، سرخ و سفید
نوجوان کہیں دکھائی نہ دیے۔۔۔۔۔ اکھاڑہ کی جگہ درد و آوار شکتے اسکول تھا،
اور اس میں چند مریض صورت گزرتے رو اور دق پوش لڑکے بیٹھے اور نگہ رہے تھے۔“

اس کے بعد وہ اپنے بچپن اور جوانی کے واقعات کا اعادہ کرتا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ محو ہوتے
ہیں۔ وہ ساٹھ سال پہلے کے دیہاتی مناظر کا نقشہ پیش کرتے ہیں، اور ہمیں ایران سے ہندوستان
میں اپنے دیکھے بھالے ملک اور اپنے وطن میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہی ان کے خیالات کا تدریجی
ارتقا ہے اگرچہ اسلوب نگارش میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، مگر ہم مستقبل کی جھلک ہمیں دیکھتے
ہیں۔

دس سال بعد کا اسلوب بیان | فارسی الفاظ کی آمیزش ان کے ابتدائی افسانوں میں نظر آتی ہے اگر ہم
ان کے کارناموں کو تاریخ وار تسلسل سے پڑھتے جائیں تو تین ہی چار افسانوں کے بعد یہ آمیزش
غائب ہوتی نظر آتی ہے۔ ”روحی رانی“ اور عشق دنیا اور حُب وطن کے بعد ۱۹۱۱ء میں ”سیر و پوش“

(زمانہ) میں شایع ہوئی اور یہ وہ زمانہ ہے کہ پریم چند نے اپنے ادبی زندگی کے دس سال پورے کر لیے ہیں۔ اس افسانے کے مطالعے سے اسلوب بیان کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب شیر سنگھ شیر سے انسان بن گئے، اور مسافر نے وہاں پہنچ کر شیر سنگھ سے دو دیا دھری کے شبہ کی بنیاد پوچھی تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا۔

”اس کا تازہ زبانہ بہت کارگر ہوا۔ باوجود اس کفارہ کے ندامت نے ابھی تک میرا دامن نہیں چھوڑا۔ دنیا کی کسی چیز کو قرار نہیں، مگر گناہ کا داغ لافانی ہے۔ نام نیک، مٹ جاتا ہے، مگر داغ گناہ نہیں مٹتا۔ میرے خیال میں ایٹوم بھی اس داغ کو نہیں مٹا سکتا۔ کوئی تلافی، کوئی کفارہ، کوئی تعزیر اس گناہ کے داغ کو نہیں دھو سکتی۔ شفاعت اور توبہ اور کنفیشن یہ سب دنیا پرست نراہوں کی ایجادیں ہیں۔ گناہ کی آگ، روح کی عظمت اور آزادی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔“

یا اسی افسانہ کا تقریباً آخری حصہ اس سے بھی سادہ اور دلا بزر ہے اور اس رنگ پر آگیا ہے جو پریم چند نے آگے چل کر اختیار کر لیا۔

پریم چند بڑا وجود صیّا پہنچ کر پینڈت جی کو لے آئی اور دو دیا دھری سے ملایا ان دونوں کے ملنے کی کیفیت پریم چند نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

”جو رہی پینڈت جی اندر آئے، دو دیا دھری اٹھ کر ان کے پیروں سے چپٹ گئی۔ دیوی نے بہت دنوں کے بعد پتی کے درشن پائے۔ ہیں۔ آنسوؤں سے ان کے سیر بکھا رہی ہے۔

جس طرح مینہ برسنے کے بعد گلاب کے پودے سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں، اسی طرح پینڈت جی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں، دونوں کے دل مسرت سے اٹھ رہے ہوئے ہیں۔ انسان خوشی میں بھی روتا ہے، جس طرح کبھی کبھی دھوپ میں ترشح ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے رخصت کی اجازت چاہی۔۔۔۔۔۔ دو دیا دھری نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں پتلیوں کی جگہ دل رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ آسان

کی طرف اٹھا کر بونی ایڈیٹرز میں اس نیکی کا بدلہ دے۔“

ہی وہ اسلوب ہے جس کو پریم چند نے اختیار کیا اور اس میں ترقی کرتے گئے۔

اکیس سال بعد کا اسلوب | اس افسانے کے گیارہ سال بعد ”لال نیتہ“ شایع ہوا۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرز تحریر میں کافی فرق ہو چکا تھا۔ وہ ایک مشاق ادیب بن چکے تھے اور زبان پر بھی انھیں پوری طور پر قابو حاصل ہو چکا تھا۔ اسی افسانے سے ہم یہاں اقتباس درج کرتے ہیں۔

”تیسرے دن بابوہری بلاس اپنے موضع میں آگئے۔ مکان بے مرمت پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف گھاس جھمگھی تھی گاؤں والوں نے دروازے پر کھاد اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ ادھر کئی سال سے بابو صاحب گھر نہ آئے تھے۔ گھر میں قدم رکھنے سے کراہیت سی ہوتی تھی..... عورتیں رنجش کے ساتھ گھر کی صفائی کرنے لگیں۔ کئی مردوں نے شیو بلاس کو جھاڑو اور ٹوکری سے نجات دلا دی۔ یہ دونوں پسینے میں مل جوتے تھے، اور سوخ رہتے تھے کہ موٹا کام دنیا میں چاہے کتنا ہی دلاویز کیوں نہ ہو، وہاقت کی دنیا میں وہ اتنا پسندیدہ نہیں۔ رام بھروسہ پنڈت نے بابوہری بلاس سے کہا ”بھیا، تم نے اچھا کیا، استیپھا دیدیا، دیں پردیں مارے مارے پھرتے تھے اب سکھ سے گھر میں رہو گے۔ گھر مٹی میں ملا جاتا تھا، اب بس جائگہ۔ شیخ عیدو نے کہا، چاکری چاہے چھوٹی ہو چاہے بڑی، چاکری ہی ہے۔ جب اللہ نے سب کچھ تمہارے گھر میں بیا ہے، تو کیوں کسی کی بندگی کرو۔“

گورچوکیدار بولا۔ ”دا بابوہرا (عہدہ) پڑا تھا۔“

بھو جو کرمی نے کہا۔ ”دا تو پڑا تھا، دا کتنے گوجیوں کا گلارہ بیتنا پڑتا، سیدنگروں کو میل بھیجا ہوگا، اس لڑائی میں پر جا کو مار مار کر صرکار کو کرج دلایا ہوگا۔ دورے پر جاتے ہوں گے، تو بیگار لینا پڑتی ہوگی، ان کے ہاتھ لکھتے کسانوں کا اخراج اور بے دخلی ہوتی“

ہوگی۔ گھر میں رہیں گے، تو اس جھنجٹ سے تو ٹلا جھوٹ جائے گا۔

گو برچو کیدار۔ رواب کتنا تھا۔ حکومت کتنی تھی۔

بھوجو۔ رواب ہرے سے نہیں ہوتا۔ رواب بھل ضمی سے ہوتا ہے۔ پدیا اور دھرم
ہوتا ہے۔ رام بھروسے پھڑٹ کون ہرے والے ہیں، لیکن کیوں سب لوگ کھاٹ سے
اٹھکر پالائے کرتے ہیں۔ تھا نیدار آتے ہیں تو ان کی کھا تر ایک چلم تما کو دینا سب کو
اکھرتا ہے۔ لیکن شاستری ہمارا جس کے گھر دس پانچ چیلوں سمیت آجاتے ہیں،
وہ اپنے بھاگ کو سراہتا ہے۔ آج جو حکم دیں تو لوگ آگ میں کودیں۔

یہ ہے پریم چند کا زور بیان اور ان کی تہہ بینی۔ وہ دیہاتیوں کی دکھتی رگ پکڑ لیتے ہیں۔ ان کے
طرز گفتار پر قادر ہیں، اور ان کے خیالات کو اپنے خیالات میں سمولیا ہے اور انہیں کی زبان
میں اتنی شیرینی حلاوت اور ولادیزی کے ساتھ ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں۔ بیان کیا
کرتے ہیں، گویا ان کا دل ہماری آنکھوں کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ یہ کمال اور یہ مصوری کسی
اور کے ہاں نہیں مل سکتی۔

یہ ایک بڑی تصویر ہے، اور انہوں نے جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے ایک وسیع میدان
پیدا کر لیا ہے۔ لیکن اگر ہم غائر مطالعہ کریں تو چھوٹی تصویریں بھی سینکڑوں نظر آئے گی۔
مثلاً وہ "میدان عمل" میں پانی پر سننے کے بعد دھوپ نکلنے کے منظر کو ان الفاظ میں پیش
کرتے ہیں۔

"آج کئی دن کے بعد تیسرے پہر سورج دیوتا نے زمین کی فریاد سنی، اور گویا رات
سے نکل کر اسے دعائیں دے رہے ہیں، اور زمین گود پھیلائے ان کی دعاؤں کو بطور ہدیہ

یہ ایک پہاڑی علاقے کی تصویر ہے۔

درشتائی کو ہستانوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہا بھرا گاؤں ہے سامنے گھٹکا کسی روشیرہ
کی طرح ہنسی دکھیلتی، ناچتی بجاتا، چلی جا رہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ

کسی بوڑھے جوگی کی طرح جتنا بڑھائے تین خیال میں محو کھڑا ہے۔
یہی گنگا مائی تاریکی میں کرشن چندر (بازا حسن) کو خود کشی کے وقت اس لباس میں
نظر آتی ہے۔ ”گنگا کسی مریض کی طرح کھرے کی چادر اوڑھے کراہ رہی تھی۔ آس پاس
کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا۔ یہ رواں تاریکی تھی۔ چاروں طرف ایسی
اداسی چھائی تھی، جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھا جاتی ہے۔“

اس سے آگے ہم نے کئی ایسے جملے نقل کر دیے ہیں جن میں چشم بصیرت نئی ہی تصویریں دیکھے گی۔
ہندی الفاظ کی آمیزش پریم چند نے اپنا ابتدائی دور سرشار اور شہر کی صحبت میں بسر کیا، اس لیے
ان کی تحریریں فارسی آمیز ہیں۔ لیکن وہ سنہ ۱۹۱۲ء میں ”سہ سوتی اور لکشمی“ کے لیے ہندی میں
کہانیاں لکھ کر مشہور ہونے لگے تو ہندی کے الفاظ بھی انھوں نے اردو میں لانے شروع کیے۔
لیکن یہ آمیزش کھانے میں نمک کے مصداق تھی ان لفظوں کو دوسرے افسانہ نگاروں نے
بھی کہیں کہیں استعمال کرنا شروع کیا۔ ان الفاظ کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

پنتی کرنا، درشن دینا، تپسیا، بردان، دھن، بل، ودیا، کھل، سیدو، سیدوک،
ودیا وان یا ودوان، بلوان، اچھا، جگ جگ جینا، من موٹا کرنا، تیاگ، بھگتی، اشیراؤ
رسوئی وغیرہ۔

اس کے بعد بعض ایسے الفاظ کو بھی انھوں نے اردو ادب میں داخل کرنے کی کوشش
کی، جو عام کی فہم سے بالاتر تھے۔ انھیں ابھی تک دیگر افسانہ نگاروں نے بھی استعمال نہیں
کیا، اور وہ قبول عام کی سند حاصل نہ کر سکے۔ مثلاً
اشٹ بھٹی، اٹم پارتھ، اُبکار، دھنتی، بدھی، پاپنا، دھرم ویر، جس کا نا بکلیٹھ،
رکھشا، نوران، سماچار، دکشا، نیوچھہ، اپرادھ، اگریہ، آلھا، کلیان کرنا، کش لالسا
گپھا، دوج، شرار دھہ، بھیترو غیرہ۔

اول الذکر الفاظ کا استعمال پریم چند نے بہت کیا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں

جن سے زبان کی شیرینی، سلاست، سادگی اور حسن میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن موخر الذکر الفاظ جہاں انھوں نے استعمال کیے ہیں، وہ بٹہنے والے کے ذہن پر ضرب لگاتے ہیں، اور اس کو سبوتا اور شیرینی زبانی کا عادی رہ کر اچانک زجر و توبیخ بھی مہلک لیبی پڑتی ہے۔ اور وہ جو دھیلی کا کی دھلا تیرا بھی سہی، لہکر خاوش ہو جاتا ہے۔

ٹیگوریت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے ابتداً ٹیگور متبع کیا، جس کا خود انہیں بھی اعتراف ہے۔ ٹیگور کے طرز کو صاحب "تاریخ ادب اردو" نے خیالی یعنی ٹیگوری اردو کے نام سے موسوم کیا ہے اور یہی وہ طرز ہے جس کو ٹیگور نے گیتان جلی میں اختیار کیا تھا۔ اس میں شاعرانہ جذبات کو شاعرانہ نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت اس کا مختصر مفید ہونا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کیے جاتے ہیں، گویا اس پر دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی مثل صادق آتی ہے۔ اس لحاظ سے پریم چند اردو ادب میں اپناناٹی نہیں رکھتے۔ ان کے مختصر جملے جن میں زیادہ سے زیادہ معنی پنہاں ہوتے ہیں، اور جن پر افسانے اور ناولوں کی بنیادیں رکھی جاسکتی ہیں، ان کے افسانے اور ناولوں میں کثرت سے ہیں۔ یہ جملے انھیں بنانے نہیں پڑے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا برف کے ٹیلوں یا ٹکڑوں کو اپنے ساتھ لیے بہا چلا جا رہا ہے ان میں اکثر جملے ایسے بھی ہیں جو مستقبل قریب میں ضرب المثل بن جائیں گے اور ان کی بھی وہی حالت ہوگی جو اب بعض ضرب المثل کی ہے کہ ہم ان کے مہنہ فین کے متعلق کوئی معلومات نہیں رکھتے لیکن ان کے جملوں کو بلا تکلف استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے چند جملے ہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کثیف برتن سے صاف پانی بھی گندہ ہو جاتا ہے نفرت سے بھرا ہوا دل پاک مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ (بیوہ)

۲۔ جلتے ہوئے دل سے دھوئیں کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے (بیوہ)

۳۔ حسد کی آگ محسوس کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے، اور

اسی وقت بھگتی ہے، جب عموماً کی زندگی کا جلاخ بکھ جاتا ہے۔ (جلوہ ایتار)

۴۔ شاعرہ شعبدہ باز ہے جس کی چٹاری میں بکھائے سانپوں کے دل بندھتے ہیں (جلوہ ایتار)

۵۔ بوڑھے بوڑھے بولتے سوجاتے ہیں اور چوہے کا ریگنسان کر جاگ اٹھتے ہیں (سنتر)

۶۔ تیوہار، تاشد دیکھنے، عمدہ عمدہ چیزیں کھانے اور بڑھیا بڑھیا پوشاکیں پہننے کا نام

نہیں ہے۔ یہ برکت ہے، یہ تمسیا ہے، اپنے بھائیوں سے محبت و ہمدردی جتانا تیوہاروں کا

خاص مقصد ہے۔ کپڑے سرخ کرنے سے پہلے خون کو سرخ بنا لو۔ سفید خون پر یہ سرخی زیب

نہیں دیتی۔ (آنسوؤں کی ہولی)

۷۔ ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا کشتی کی ناراضی کے مُرادت ہے۔ (ادیب کا مٹ)

۸۔ جس طرح سوکھی لکڑی جل اٹھتی ہے، اسی طرح بھوک سے باولا انسان ذرا ذرا اسی

بات پر تنک جاتا ہے۔ (بڑے گھر کی بیٹی)

۹۔ عورت گالیاں سہتی ہے، مار سہتی ہے، مگر سیکے کی نندا اس سے نہیں ہی جاتی۔

(بڑے گھر کی بیٹی)

۱۰۔ دلوں کا میل دھونے کے لیے آنسوؤں سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں۔

(بڑے گھر کی بیٹی)

۱۱۔ جو پسینہ بہائیں، وہ روٹیوں کو ترسیں، اور جنھوں نے حرام کاری کو اپنا پیشہ بنا

لیا ہے، وہ ہماری محفلوں کی زینت بنیں۔ میں یہ جو رو ستم نہیں دیکھ سکتا۔ (راج ہٹ)

۱۲۔ سکارا آدمی کو اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے، وہ کسی دردیش کا دل کو بھی شکل

سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا دل روتا ہے، مگر ہونٹ ہنستے ہیں، دل مسرت کے مزے لیتا

ہے، مگر آنکھیں روتی ہیں۔ دل حسد کی آگ سے جلتا ہے، مگر زبان سے قند و شکر کی ٹدیاں

بہہ نکلتی ہیں۔ (آلھا)

۱۳۔ پجارن کا کام تو پوجا کرتا ہے۔ دیوتا اس کی پوجا قبول کرتا ہے یا نہیں یہ سوچنے کا

اسے فرصت کہاں ہے۔ (کسم)

۱۴۔ مردہ دلوں کے لیے دنیا ویران ہے (کسم)

۱۵۔ مردوں کے لیے بیوی پیر کی جوتی، اور عورت کے لئے مرد دیوتا ہے، بلکہ اس سے

بھی بڑھ کر۔ طلوع شعور کے ساتھ ہی وہ شوہر کے نام پر بک جاتی ہے۔ (کسم)

۱۶۔ ایشور تام باتیں دے کر جھوٹا غرور نہ دے۔ (دوسکھیاں)

۱۷۔ تنہائی رنج کو اور بھی جان گسل کر دیتی ہے۔ (جمہوری)

۱۸۔ تفریح جدت کی غلام ہے اور جدت کو تقویم پارینہ سے نفرت۔ (جمہوری)

۱۹۔ اعتقاد عورت کا وصف ہے۔ (جمہوری)

۲۰۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمکا ڈر بسیرا لیتے ہیں۔ (جمہوری)

۲۱۔ سیاسیات کے رموز حال تنقید نہیں ہوتے۔ (یلی)

۲۲۔ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو دلیلوں سے آدمی کی تشفی نہیں ہوتی۔ (مزار الفت)

۲۳۔ نفرت دلیلوں کی محکوم نہیں۔ (مزار الفت)

۲۴۔ گھر سے نکلی ہوئی عورت، تھان سے بھاگی ہوئی گھوڑی ہے، جس کا کچھ بھروسہ

نہیں۔ (ابھاگنی)

۲۵۔ چوٹ کی گرمی میں درد کا احساس نہیں ہوتا۔ زخم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ٹیس ہونے

لگتی ہے۔ (گھاس والی)

۲۶۔ کسی کی تشعبیح کرنا، اس کی نگاہ میں اپنا وقار کھونے کا نہایت آسان نسخہ ہے۔

(بازیافت)

۲۷۔ صورتِ افلاس، افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ (بازیافت)

۲۸۔ یہاں حرارت اس نقطہ پر ہے، جہاں آگ لگ جاتی ہے۔ (بازیافت)

۲۹۔ صبر کا بادلوں سے ٹوٹ جاتا ہے، تو خواہش کا بہاؤ تابو سے باہر جاتا ہے۔ (بوزی کالی)

۳۲۔ صنف لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتلے بن جاتے ہیں۔ (بنک کا دیوالہ)

۳۱۔ مایوسی مجال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ (بنک کا دیوالہ)

۳۴۔ ہمارے جذبات پیش بندیل کے سطح نہیں ہوتے (سوتیلی ماں)

۳۳۔ نفس کے سامنے ایک بار سر جھکانے کے بعد پھر سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔ گناہ کی

انتھاندی میں جھسل کر ہم دم بدم پیچھے ہی ہوتے جاتے ہیں۔ (ایمان کا فیصلہ)

۳۴۔ گناہ کے قابو میں آیا ہوا دل خزاں کا مارا ہوا پتہ ہے جو ہوا کے جھونکے سے گر پڑتا ہے۔

(ایمان کا فیصلہ)

۳۵۔ ندی کی لہریں چاروں طرف چلتی ہیں، لیکن دھارا اپنا راستہ نہیں چھوڑتی۔

(درگاہ کا مندر)

۳۶۔ مصیبت پڑنے پر انسان کچھ ضعیف لا اعتماد ہو جاتا ہے۔ دواؤں سے مایوس ہو کر

ہم دیوتاؤں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ (درگاہ کا مندر)

۳۷۔ اجڑا ہوا گاؤں، کھویا ہوا اعتبار ہے۔ (بانجھا زحیدار)

۳۸۔ غمناک خیالات تنہائی کے منتظر رہتے ہیں۔ (مرہم)

۳۹۔ کمزور ارادہ ہمیشہ سوال اور دلیں کی آڑ لیا کرتا ہے۔ (غیرت کی کنار)

۴۰۔ مردوں کے دل پر حسن ظاہر کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے وہ دل کی قدر کرنی جانتے ہی نہیں۔

(شکست کی فتح)

۴۱۔ خودی جب بیدار ہوتی ہے، تو دل کی کمزوریاں اس کے قریب آتے ڈرتی ہیں۔

(خودی)

۴۲۔ کوڑیوں سے روپیہ بنانا ہوا پاروں کا کھام ہے۔ بابو لوگ تو روپیہ کی کوڑیاں

بناتے ہیں۔ (غبن صفحہ ۹۸)

۴۳۔ دل پر چوٹ لگتی ہے، تو آدمی کو کچھ نہیں سوجھتا۔ (غبن)

۲۴۔ محبت اپنے معون پر پہنچ کر پرستش بن جاتی ہے۔ (ضمن صفحہ ۲۲۵)
 ۲۵۔ انسان کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب اسے اپنی نیکیوں پر چھٹانا پڑتا ہے۔
 (بازار حسن کی پہلی سطر)

۲۶۔ آج کل دھرم ریاکاروں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ (بازار حسن صفحہ ۲۸)
 ۲۷۔ فیشن وہ شاعرانہ خیال ہے، جو خون دل پی کر پلتا ہے، مگر حاصل بجز واہ و لکے اور

کچھ بھی نہیں۔ (بازار حسن صفحہ ۹۴)

۲۸۔ حکام کی آنکھیں نہیں ہوتیں صرف کان ہی ہوتے ہیں۔ (بازار حسن صفحہ ۱۲۹)

۲۹۔ برسات کی آخری بوندوں کی طرح انسان کی آخری نصیحتیں بیکار نہیں جاتیں۔

ایسے سینکڑوں جملے ان کتابوں میں ملیں گے۔ کوئی افسانہ ایسے جملوں سے خالی نہیں اردو ادب

کے بہت کم ادیب ہوں گے جن کے پاس ان جواہر ریزوں کی اس قدر فراوانی ہوگی۔

پریم چند کی تشبیہیں | پریم چند نے نئی نئی تشبیہیں اچھوتے استعارے اور نادر الفاظ بھی استعمال کیے

ہیں اور اپنی طرف سے نئے الفاظ بھی بنائے ہیں ان کے ثبوت میں چند جملے یہاں پیش کیے جاتے

ہیں۔

۱۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قائم بنا ہوا تھا۔ (منتر)

۲۔ آج دس سال سے ضبط کر رہا ہوں۔ اپنے سینے کے اندر ایک کرہ نار چھپائے بیٹھا

ہوں (خانہ برباد)

۳۔ جواہر نگار خول کے اندر جیسے تیز تلوار چھپی رہتی ہے اس طرح عورت کا نازک دل صبر

اور استقلال کو اپنی گود میں چھپائے رہتا ہے۔ غصہ جیسے تلوار کو باہر کھینچ لیتا ہے، اسی طرح

الفت عورت کے صبر اور استقلال کو بیدار کرتی ہے۔ (ماں)

۴۔ وہ شاعر کے تخیل کی طرح مسرت اور آرزو کی چیز تھی۔ (لیلیٰ)

۵۔ اگن دیوتا اپنی آتشیں زبانوں سے دھرم ویر کا جس گار ہے میں۔ (جہاد)

۴۔ سائیس اپنی تاخیر المراد ہوں کو لیے آجاتی ہیں۔ (خواب پریشان)
 ۷۔ جوتشی کی تقدیر خوانی، تقدیر سے بھی زیادہ مبہم، اور ان کے الفاظ مبالغہ سے
 بھی زیادہ وسیع المفہوم۔ (خواب پریشان)

۸۔ اس کے رخصت ہوتے ہی ہوا کے محور جھونکے چلنے لگے۔ (راہ خدمت)
 ۹۔ معلوم نہیں کہ اس نے میرے کتنے در سے لگائے۔ یہاں تک کہ قہمی کو مجھ پر رحم
 وہ پھٹ کر ٹوٹ گئی لکڑی کا کلیجہ بھٹ گیا، مگر انسان کا دل نہ بچھلا۔ (خون حرمت)
 ۱۰۔ چٹان سے ذرا دور ایک گھنا پاکھر کا درخت تھا، جس کی جڑیں خشک پتھروں سے
 جھٹ کر ان سے قوت نیروں حاصل کرتی تھیں، جس طرح کوئی مہاجن مجلس آسامیوں کو
 جکڑ کر ان سے سود کے روپیے وصول کرتا ہے۔ (مرہم)

۱۱۔ جب کشتی کروٹ لیتی، تو لوگوں کے دل اچھل اچھل کر بہوں تک آجاتے۔ (غنن صفحہ ۳۶)
 ۱۲۔ سب اس عورت پر مرٹے جاتے تھے۔ کاش اور حریف سب کے چہرہ پر کھنچا ہوا

تھا۔ (بازار حسن صفحہ ۵۰)

۱۳۔ اس کی بہت برف کی طرح بگھلی جاتی تھی۔ (بازار حسن صفحہ ۸۳)
 ۱۴۔ جگر دھرتصویر لے کر اپنے کمرے میں گئے، اور اس کو آنکھوں سے پینے لگے۔

(پرودہ مجاز صفحہ ۱۷)

۱۵۔ شباب کی امید پیال کی آگ ہے جس کے جلنے اور بجھنے میں دیر نہیں لگتی یا کسی نلوار

کا پتھر جو شام کو بنتا اور صبح کو بگڑ جاتا ہے۔ (بازار حسن صفحہ ۲۱۴)

پہلی جگہ کی زبان ان جلوں میں نہ صرف ندرت بیان۔ صناعمی الفاظ اور شاعرانہ خیالات سمجھنے
 گئے ہیں بلکہ دلگداز اثر بھی شامل ہے۔ اگر یہ اثر ان چھوٹے چھوٹے جلوں میں نہ ہوتا، تو یہ
 سارے کے سارے جلے بھونڈے، بے جان اور جاپانی مال کی طرح نمائشی ہو کر ٹھٹھک جاتے،
 اور ان کے افسانے میں وہ خوبی، بلند معیاری اور دلاویزی پیدا نہ ہوتی، جو ان کا خاص وصف ہے۔

الفاظ کے ساتھ اصوات کی ہم آہنگی بھی ان کی دلکشی کا سبب ہے، اور یہ چیران کے زبان پر قابو رکھنے کی شاہد ہے۔ وہ غیر معمولی قلب و دماغ کے آدمی تھے۔ انہوں نے زبان کو بعض اور مشہور ادیبوں کی طرح مطبوع ہو کر نہیں بلکہ قابض ہو کر استعمال کیا اور اپنی شخصیت کی خصوصیات کو نمودار کیا۔ ان کی زبان فطری اور ملیں ہے وہ جہاں اس میں درد بھڑا جاتے ہیں بھر دیتے ہیں اور جہاں ظرافت کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ظرافت۔ لیکن ظرافت سے زیادہ ان کی عود کی تصویریں کامیاب اور معیاری ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بہت دور اندیش اور باریک بین تھے اور ان کی عمر کا وہ حصہ جو غور و فکر کا زمانہ ہوتا ہے، دیہات میں بسر ہوا۔ دیہات کی آبادی کسان اور مہاجن ہی پر مشتمل ہوتی ہے، اور کبھی کبھی ارباب اقتدار گاؤں کی چوپال میں آجاتے ہیں، تو ایک ہما بھی پیدا ہو جاتی ہے، اور دار و گیر کا ہنگامہ بلند ہوتا ہے۔ پریم چند دیکھتے ہیں، کہ اگر داروغہ آئیں تو کسان ہی ان کی ہریگاڑ سہتے ہیں۔ مہاجن کے تو وہ بندہ بنے نام ہیں، اور آبا و اجداد کے رسم و رواج پر سختی سے کار بند، ان کو دیکھنے کے بعد درد مند دل سے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پریم چند کا دل نہ صرف خود روتا ہے بلکہ ان کی قوت بیان اوروں کو بھی رلاتی ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی ان کی اس خیالی زندگی سے بالکل برعکس تھی وہ زندگی کے معنی ہنس بول کر گزارنے کے لیتے تھے اور اپنی زندگی ایسی ہی بسر کرتے تھے بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی چار کے سامنے مسکراتے، ہنستے، بلکہ تہقہے لگاتے تھے۔ ایسا تہقہ جو انہیں لوگوں کو دیوانہ سمجھنے پر مجبور کر دے۔ لیکن وہ جب قلم کے دھنی ہو کر بیٹھتے ہیں تو دل میں ٹیسیں پیدا کرتے ہیں، لیکن علامہ راشد الخیری کی طرح نہیں بلکہ رشید احمد صدیقی کے مزاح کے متضاد کہ وہ ہمارے لبوں تک تبسم کو کار فرما کرتے ہیں اور پریم چند ہمارے دل کو کپکپا دیتے ہیں۔ یا مقبول احمد پوری کے الفاظ میں۔

”راشد الخیری مرحوم دل کو پکڑتے ہیں تو بغیر دکھائے اور رلائے نہیں چھوڑتے پریم چند

کو جب کہیں ایسا موقع آ جاتا ہے تو دل کی رگوں پر اس طرح انگلیاں رکھتے ہیں گویا

ان تمام چیزوں پر بحث کرنے کے بعد ایک آخری چیز رہ جاتی ہے وہ یہ کہ پریم چند نے حالات حاضرہ کے ادب کو تو متاثر کیا مگر خود کسی قسم کا اثر نہیں لیا۔ ہمارا جدید ادب اب جنسیات اور عریانیّت کا بلندہ بنتا جا رہا ہے، لیکن پریم چند اس سے بہت دُور ہے۔ طالبِ اَدبِ اَدب کی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ

”پریم چند کی ایک خصوصیت مجھے اور نظر آتی ہے کہ ان کے کسی ناول میں روزِ جنسیت کے فلسفے کی چھاؤں ہے اور نہ کہیں عریانی۔ دراصل فحش اور سوقیانہ انداز تحریر سے ان کا دامنِ قلم کبھی آلودہ نہیں ہوا۔“

یہ خصوصیت صرف نادلوں کے لیے ہی باعث امتیاز نہیں، بلکہ افسانے بھی اسی صفت میں آجاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند عصر حاضر کے نفسیاتی سیلاب میں نہیں بہ گئے بلکہ نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ اس منجھار میں گھڑے ہو کر دوسروں کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس لحاظ سے ان کا سرمایہ ادب، اردو کے افسانوی ادب کی جان ہے۔

شاید لطیف نے اپنے مضمون (ترقی پسند افسانوی ادب) میں لکھا ہے کہ

”اس نئے ادب سے بھوک اور نفسانیت کو نکال لیا جائے تو بہت کم باقی بچے گا۔“

پریم چند کے افسانوں میں بھوک کی کمی نہیں لیکن ان کے کرداروں کا معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ وہ اپنی بھوک کو ظاہر نہیں ہونے دیتے، اور اس طرح شاید صاحب کے کلیہ سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں۔

مکن ہے کہ صاحب مضمون نے پریم چند کو ترقی پسند ادیبوں میں شمار ہی نہ کیا ہو لیکن وہ ان کی کانفرنس کی صدارت کر چکے تھے اور انھیں خیالات کے حامی تھے، جو ترقی پسند ادیبوں میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ آنکھیں اور زبان وہ نہ تھی جو آجکل کے بھوکے اور بقول کسے کیچڑ اچھالنے والے ادیبوں کی ہے۔

چھٹا باب افسانہ نگاری کے علاوہ پریم چند کی دیگر خدمات

پریم چند کی ناول نگاری پریم چند نے جس طرح افسانوی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا وہ ناول نگاری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے بیان کرنے میں موجودہ دور کے ناول نگاروں میں کسی نے زیادہ حصہ لیا ہے تو وہ پریم چند ہیں۔ ان کی ادبی زندگی ناول نگاری سے شروع ہوئی اور ناول نگاری ہی پر ختم ہوئی ”ہم خرمادہم ثواب“ سے پہلے ان کا کوئی ناول اردو میں منظر عام پر نہیں آیا اور ہندی میں بھی اسی کے ترجمے (کشتا) سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس سے دو تین سال پہلے انھوں نے چند کہانیاں لکھیں اور وہ تعداد میں اتنی نہیں ہوئیں کہ ان کا کوئی مجموعہ شائع کیا جاسکتا۔ اس طرح ان کی ابتدا ہوئی۔ ان کی انتہا بھی اس طرح ہے کہ ان کا قلم (گودان) لکھ کر ہمیشہ کے لیے رک گیا۔ (ہم خرمادہم ثواب) سے لیکر (گودان) تک اردو میں بارہ اور ہندی میں گیارہ ناول لکھے جن میں اکثر ایک دوسرے کے ترجمے ہیں یوں تو ہر ناول بجائے مکمل ہے لیکن (بازار حسن) اور (بچوگان ہستی) لاجواب ہیں (بچوگان ہستی) کو اردو دنیا شاہکار مانتی ہے اور پریم چند بازار حسن کو اپنا شاہکار سمجھتے ہیں۔ ہم یہاں ہر ناول کے متعلق سرسری طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم خرمادہم ثواب ۱۹۰۲ء اس کے متعلق ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ یہ ان کا سب سے پہلا ناول ہے اور اس کو انھوں نے بلحاظ مکالمہ و منظر نگاری شہر کے رنگ میں اور بلحاظ زبان سرشار کے انداز میں لکھا ہے۔ یہ ان کی پہلی کوشش ہے۔ اس لیے ہر لحاظ سے اس میں خامیاں ہیں۔ کہیں دو ایک بڑے ادیب کی تقلید کرتے ہیں، کہیں دوسرے کی۔ کسی ایک کی طرز پر نہیں لکھتے

اس لیے اس ناول میں ان کی انفرادیت پیدا ہونے نہ پائی۔ اس ناول کی فائنت اس دور کے عام ناولوں سے ہنجر عشق و محبت کی اشاعت سے زیادہ قومی خدمت ہے۔ ہیواؤں کی حالت زار کا خاکہ کھینچا ہے اور دولت مندوں اور خوشامد پسندوں کی فطرتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک چیز جو خاص طور پر ان کے افسانوں اور ناولوں میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ پریم چند اپنے قاری کو نتیجے کے انتظار میں نہیں رکھتے۔ ناول کا پہلا باب۔ افسانہ کا پہلا فقرہ یا اس کے پہلے جملے یا کتاب یا افسانہ کے نام ہی سے وہ نتیجے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ذرا غور طلب ہوتا ہے۔ (ہم خرما و ہم ثواب) کا مطالعہ بتا دے گا کہ قومی خدمت اور عشق و محبت دونوں ساتھ ساتھ کار فرما ہیں۔ دونوں اپنے راستوں سے بھٹکتے نہیں بلکہ اپنی منزل کی طرف برابر گامزن ہیں اور کامیابی کے ساتھ جا پہنچتے ہیں۔ اب یہ (ہم خرما و ہم ثواب) سے زیادہ اچھا کیا نام تجویز کرتے۔

جلوہ ایشیا یہ سنہ ۱۹۱۲ء میں شایع ہوا۔ یہ دوسرا ناول ہے اور ابھی وہ مشاق ناول نگار نہیں ہوئے لیکن پہلے ہی باب میں ان کا زور قلم نہیں متحیر کر دیتا ہے، اور ہم اس کے مطالعے کے بعد اپنے آپ کو ایک مقدس اور پر عظمت مقام پر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس میں مکالمہ کی شان بہت بڑھی ہوئی ہے۔ سباما اور دیوی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ ہم اسی انداز میں پڑھتے ہیں گویا مخاطبت ہمارے سامنے ہو رہی ہے۔ پھر پریم چند کی عظمت ہماری نگاہوں میں زیادہ ہو جاتی ہے جبکہ وہ سباما کی زبان میں دیوی سے سپوت بیٹا طلب کرتے ہیں اور سپوت کی تعریف یہ ہے ”جو اپنے دل سے ابکار کرے“۔

نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے استعمال کیے ہیں۔ پامال اور فرسودہ تشبیہیں اور تشبیہیں بہت کم ہیں۔ ہر جگہ ان کی طبیعت کی جولانیاں زور دکھاتی ہیں۔ بعض جگہ جنسی امتیاز کو انہوں نے قائم نہیں رکھا اس لیے واقعاتی نقطہ نظر سے ناول غیر فطری ہو گیا ہے، لیکن سرسری طور پر پڑھنے والے کی نظر اس پر نہیں پڑتی۔ وہ تو ایسا ادنیٰ نٹ ہوتا ہے جس کی ہمار

مصنّف کے ہاتھ میں ہو۔ اس ناول میں اور اس کے علاوہ دو ایک اور ناولوں میں بھی پریم چند نے بعض ایسے واقعات لکھ دیے ہیں، جنہیں ہم مافوق الفطرت کہتے ہیں یا جن کا تعلق صرف عقائد سے ہے۔ ایسے واقعات اس میں شک نہیں کہ ہیرو کے اوصاف میں اضافہ کرتے ہیں اور اس کے کردار کو بلند کر دیتے ہیں لیکن ان کا اثر دیر پا نہیں ہوتا۔ ناول کے اختتام تک ان کی زبان کی شیرینی اور حلاوت ہمیں لاپرواہ نہیں ہونے دیتی، لیکن اس کے بعد ان واقعات پر تنقیدی نظر پڑنے لگتی ہے۔

فنی نقطہ نظر سے یہی نہیں بلکہ اکثر ناولوں میں پلاٹ غائب نظر آئیں گے۔ تدریجی ارتقاء بھی بعض ناولوں میں بسرعت ممکن ہو گیا ہے اور بعض جگہ بہت دیر میں، اس طرح ہماری ذہنی کشمکش تشنہ رہتی ہے اور ہم پوری طور پر لطف اندوز نہیں ہونے پاتے۔ (ہم خرما و ہم ثواب) کے مقابلے میں اس کی زبان معینت ہے لیکن پھر بھی دیگر ناولوں کے جیسی نہیں اور ہندی اور سنسکرت کے الفاظ تو (ہم خرما و ہم ثواب) سے زیادہ ہیں۔ شاید یہ بالاجہ کے کارن ہوں۔ اس وجہ سے بھی بعض جگہ زبان ثقیل ہو گئی ہے۔

نرملہ | ایک المیہ ناول ہے، جس میں ایک خاندان کی مصیبتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ہی خاندان پر ان مسلسل مصائب کے پہاڑوں کا ٹوٹنا قیاس میں تو نہیں آتا، لیکن پریم چند کی زبان ہے اس لیے الفاظ دل میں اور واقعات آنکھوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ سارے ناول کے مطالعے کے بعد بھی ان کے کرداروں سے ہمدردی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ بھگتی پھرتی ہے۔ زبان میں دوسرے ناولوں کی طرح شوخی اور شیرینی الفاظ کا ترنم اور گھلاوٹ نہیں اور ڈرامائی انداز تحریر میں بعض جگہ مچکا پن پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا سبب اس کی طوالت ہے۔ پریم چند جزئیات کی تفصیل میں جانے کے لیے قاری کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور اس طرح حلاوت میں روانی باقی نہیں رہتی۔

بہوہ | اس ناول کے متعلق ہم موضوع کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی گھروں میں

ایسے ٹھروں کی بہتات ہے، جہاں بیوائیں موجود ہیں۔ وہاں کے معمولی سے معمولی واقعات پر بھی پریم چند کی دور رس نظریں جا پڑتی ہیں۔ ان کا طرز بیان انھیں واقعات کو ایسا دلنشین اور دلاویز بنا دیتا ہے، کہ فنی نقائص نکتہ چین کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ مگر دل کی آپس کی کشیدگیاں، رسم و رواج کی پیچیدگیاں اور زندگی کے چند مسرت بخش لمحے سب ہی اس میں موجود ہیں۔ امرت رائے اور پورنا کا کردار جس خوبی سے بیان کیا گیا ہے، اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ ددھو آشرم کے انتظام کا خاکہ جس ماہرانہ انداز میں ڈالا گیا ہے، وہ قوم کے لیے مشعل راہ ہے۔ پریم چند کی زبان بھی اس ناول میں بہت سلیس ہو گئی ہے۔ اور فارسی کے الفاظ کی جگہ ہندی کے سبک اور گھل مل جانے والے الفاظ نے لی ہے۔

بازار حسن | یہ وہ ناول ہے جس کو پریم چند اپنا شاہکار سمجھتے تھے اور اگر جوگان ہستی ان کی تصانیف میں نہ ہوتی تو واقعی یہی شاہکار سمجھا جاتا۔ زبان اور دلچسپیوں کے لحاظ سے اس ناول کا معیار بہت بلند ہے۔ اور ناول کا موضوع، پریم چند کا وہی مطمح نظر، قوم کو سدھارنا اور نیکیوں کی طرف راغب کرنا ہے۔ وہ اس ناول میں اپنے کرداروں کو گناہوں کے سمندر میں ڈھکیل دیتے اور پھر کافی غوطے کھلانے کے بعد ان کی پاپ کی نیا کو نیکی کے دھارے پر لا ڈالتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد دعوت عمل ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ انسان لغزشوں کے بعد ہی سنبھلتا ہے، اور ٹھوکریں کھا کر ہی سیدھا راستہ چلتا ہے۔ ایک اور چیز یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ حسن کو صرف لٹانے کی دولت نہیں سمجھتے، بلکہ اس سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں ان کے ”زادراہ“ کے ایک افسانے ”وفا کی دیوی“ میں ان کا یہ مقصد ابلا پڑتا ہے۔ ان کا ايقان ہے کہ انسان کے حسن میں ذوق عمل کو کسانے اور بیدار کرنے کی طاقت ہے۔ وہ جہاں چشم دابرو کے اشاروں سے قتال عالم بن سکتا ہے، وہیں انسان سے ایسے مافوق الفطرت کام بھی کروا تا ہے، جو ہمارے دہم دگان میں بھی نہیں آتے۔ ان کے کرداروں میں خدمت خلق کا عزم اتنا استوار ہوتا ہے کہ کسی کردار سے آخر تک لغزش ہونے نہیں پاتی۔

اور اس طرح وہ سماجی حالات کے درست کرنے کے لیے خاک بھی پیش کر دیتے ہیں۔
چوگان ہستی اہم اس کتاب کے مستحق اپنی رائے کا اظہار کرنے کی بجائے صرف دو آرا پر اکتفا کرتے ہیں اس لیے کہ چوگان ہستی ہی وہ کتاب ہے جس کو بیسویں صدی کے ربح اول کا بہترین ناول تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی فرماتے ہیں۔

”سب سے بڑھ چڑھ کر ان کی ضخیم کتاب دو جلدوں میں ایک ہزار صفحہ کا ناول چوگان ہستی ہے، کہیں سے بھی کھول لیجئے یکساں دلچسپ۔ شروع کر دینا شرط ہے، ختم کیے بغیر جی نہیں کا نہیں۔ آدرد اور تصنع کہنا چاہئے کہ ان کا قلم جانتا ہی نہیں۔ جو صفحہ بھی اُلٹ کر دیکھئے سادگی، بے ساختگی اور آمد کے لحاظ سے خطہ گلزار جس حصہ کا بھی انتخاب کیجئے دلکش و لادیر اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونہ بہار ہے۔“

طالب الہ آبادی اسی کے مستحق رقم طراز ہیں۔

”اگر پریم چند نے ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے کامیاب افسانہ نویسوں کی صف میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ چینی، جاپانی، مرہٹی، جرسی اور ہندی سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔ ”لائٹ از اسے ایشیج“ اور ”ورلڈ از لے تھیرٹھ“ ایسے کامیاب ناول بھی اس کے ساتھ تو لے جائیں تو شاید بلکہ ٹھیریں۔“

اردو ناول کا یہ پہلا قدم ہے، جہاں فطرت اور اخلاق نے رسمی شان و شکوہ کو چھٹا دیا ہے، اور جہاں ”درد“ اور ”خدمت“ کو اس کی اصلی جگہ ملی ہے۔

اس ناول میں نفسیاتی خوبیاں بھی ہیں اور زور بیان کا لطف بھی ہے اس کی ہر چیز اثر بھری ہوئی ہے طوالت ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ ناظرین کا کہیں سے دل گھبرا جائے۔ لفظ

ہی ہیں، جو ہم آپ ہر وقت بولتے ہیں پر جو ہری کے ہاتھوں میں ان کا رنگ کچھ اور ہی ہے
..... وہ ایسے چھینے بن گئے ہیں، جن کے ہر زاویے سے نور کی جوت نکلتی ہے۔

پردہ مجاز ساری کتاب عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہر جگہ حیرت ہوتی ہے کہ پریم چند
فطرت نگار ہو کر مافوق الفطرت چیزیں کیسے لکھ گئے۔ مثال کے طور پر جگدیش پور کے راجہ کے
تین جنم اور ہر جنم کی پوری یادداشت۔ تاریک گھاٹی میں محل کا وجود جہاں چار ہزار سال پہلے کے
آلات بھی موجود ہیں۔ ہوائی جہاز بھی ہے جو باد و باراں میں مستقل انداز سے اڑا جاتا ہے۔ گویا
فطرت کی طاقتوں پر فتح کا نقارہ بجا رہا ہو۔ ہیوی کا دومرتبہ اعادہ شباب اور رانی دیو پر یا کا
کیر کٹر حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ چکر دھریا تو دھنا سنگھ
کے الفاظ میں دیا اور دھرم کا پتلا بنا ہوا تھا اور دروگہ کو بچانے کے لیے اپنی چھاتی پر سنگین
روک لی تھی ”یا پھر اپنے راج میں اگر دیہاتی کے ساتھ براسلوک کیا۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح
اچانک پیش آتا ہے کہ ناول کا پڑھنے والا اس کے سننے کے لیے تیار نہیں رہتا۔ پریم چند ایک
طرح سے یقیناً کامیاب ہیں کہ ان کا قاری ہمیشہ مستقبل کا منتظر رہتا ہے، اور پڑھتا چلا جاتا
ہے، لیکن پردہ مجاز کو ختم کرنے کے بعد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ چند چیزیں ایسی بھی باقی رہ گئی
ہیں جو محتاج اظہار ہیں اور انہیں کھلنے کا موقع نہیں ملا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول مسئلہ تناسخ کی تشریح اور ویدانت فلسفہ کی توضیح
کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو کئی حاصل کرنے کے
لیے بے لوث محبت اور بے عرض خدمت کی ضرورت ہے ایسی محبت اور خدمت جس میں نفسانی
اور شہوانی جذبات کا قطعاً وجود نہ ہو۔

کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلی اگرچہ تہید ہے لیکن دلچسپ، مربوط اور نہایت

سلیس و صاف ہے۔ لیکن دوسری جلد غائت تصنیف کا اظہار، مسائل کی وضاحت، مسئلہ
تنازع کی پیچیدگیوں اور عمیر العقول کا رناموں سے معمور ہے۔ لیکن دلچسپی کا اس لیے فقدان نہیں کہ
پریم چند ہیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

خین | موضوع کے سلسلہ میں ہم کہہ آئے ہیں کہ ہندوستانی عورت کا زیور کا شوق اور اس کی
تکمیل کے لیے شوہروں کو دست خیب کی امداد اور پھر قرضہ کا باریہ ساری چیزیں بنیاد افسانہ
ہیں لیکن بات بڑھتی گئی اور افسانہ طول کھینچتا گیا جیسا کہ ندی پہاڑوں سے نکلتے وقت تو
چھوٹی سی تھی لیکن سمندر سے ملنے تک اس میں ہزاروں ہی نالے اور ندیاں آکر مل گئیں۔

واقعات ایک حد تک فطری ہیں، مگر بعض جگہ کھٹکتے بھی ہیں۔ امیر اور غریب، مقیم اور مسافر
کسبی اور شریف زادی، پولس اور مظلوم، سبھی کی کیفیتیں اس میں موجود ہیں۔ پولس، ہتھیاروں
کا بیان نہایت تفصیلی ہے۔ تبدیل مکانی کی وجہ سے ناول میں دلچسپی تو پیدا ہوگئی لیکن فنی نقطہ
سے نقص پیدا ہو گیا۔ جالپا کی شوہر پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور ہندوستانی عورت سے
ایسے واقعات کا سرزد ہو جانا تعجب خیز بھی نہیں۔ خود زہرہ اس کے کردار کا صحیح نقشہ ان
الفاظ میں کھینچتی ہے ”وہ اوپر سے موم ہے اور اندر سے پتھر۔ جو اتنی نازک ہو کر بھی اتنی
مضبوط ہے۔“ آخر میں ایک چیز ”بازار حسن“ کی طرح یہاں بھی ملتی ہے پریم چند حسن سے ذوق رکھنے
کو بیدار کرتے ہیں اور اُما اپنا بیان دیتے ہوئے اجلاس پر کہتا ہے ”جالپا کی بے نفسی۔ حتیٰ بند
اور استقلال نے میری آنکھیں کھولیں اور اس سے بھی زیادہ زہرہ کی دلجوئی اور خلوص نے۔
میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس طرف سے روشنی ملی جدہ اردوں کو تاریکی ملتی
گوشہ عافیت | زبان۔ مکالمہ۔ سیرت نگاری اور واقعاتی لحاظ سے یہ ایک مکمل ناول ہے
بیساج کی پابندیاں۔ رسم و رواج کے قوانین۔ رشوت ستانی مادیت اور روحانیت۔ مغربیت
اور مشرقیت ان تمام چیزوں کو خوبی کے ساتھ سمویا ہے اور ان سے جو نقصانات قوم کو

اٹھانے پڑ رہے ہیں، انھیں بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ نفسیاتی باریکیاں بھی نہایت فن کارانہ ہیں اس کے دوسرے حصہ کا معیار اتنا بلند نہیں جتنا کہ پہلے کا، بلکہ دوسرا اتنا گہرا پست نظر آتا ہے۔ بعض واقعات بھی حقیقت سے بُدر رکھتے ہیں۔

میدانِ عمل اور ناولوں کی طرح اس میں بھی سلاج کے نقائص کو منظر عام پر لایا گیا ہے، اور ان کے دور کرنے کے علاج بتلائے گئے ہیں۔ جس طرح ابتدائی دور یعنی ”ہم خرم او ہم ثواب“ اور ”بیوہ“ وغیرہ میں عقدہ یوگان اور دودھوا آشرم کے قیام پر زور دیا گیا ہے اس میں اچھوت تحریک دیہات سدھار تخفیف لگان تنظیم مزدور پارٹی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس طرح ایک لحاظ سے یہ ناول ہمارے گذشتہ دس پندرہ سال کے سیاسی رجحانات کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن کار قلم سے کردار نگاری کا بھی کمال دکھاتے ہیں اور نفسیاتی باریکیاں بھی ہر جگہ جھلکی پڑتی ہیں۔ ہمارے رہنمایان قوم اپنے آپ کو کس طرح خدا کے ملت سمجھتے ہیں اور جہاں کس طرح غریبوں کا خون چوستے ہیں، ان کی تصویریں نہایت ماہرانہ انداز میں کھینچی گئی ہیں۔ پلاٹ کی ترتیب اور خوبی۔ قصہ کا ارتباط اور تسلسل اس کا تدریجی ارتقاء سیرت نگاری اور وہ تمام نزاکتیں اور لطافتیں جو لزومِ افسانہ ہیں اس میں موجود ہیں۔ زبان سب ناولوں سے زیادہ اچھی اور دلکش ہے۔ چونکہ یہ انسانی کارنامہ ہے اس لیے واقعاتی نکتہ نظر سے اس میں معمولی نقائص ہیں جو درخورِ اعتنا نہیں۔

گنودان نام کچھ عجیب سا ہے۔ اردو خوان طبقہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کتاب میں کیا ہو گا اصل کتاب ہندی میں ہے اور اس کا بھی یہی نام ہے لیکن جس طرح پریم چند نے پریم آشرم اور کرم بھری وغیرہ کے نام بدلے، اگر اس کا بھی موزوں نام دیا جاتا تو مناسب ہوتا۔

یہ ناول دیہاتی مناظر اور غریبانہ زندگی کا مرقع ہے۔ ہندوستان کی حقیقی تصویر ہے۔ نظروں کے سامنے آتی ہے۔ غریب کسان کی زندگی، اس کا چھوٹا سا جھونپڑا، اس کے جانور، اس کے کمیت اور اس کے فاقہ کش جسم میں سے اس کی ہڈیاں ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

ہمارے سراج میں عورت کی کیا حقیقت ہے، اور اس کو مشرقی عورت کا کس طرح نمونہ بنایا جائے؟ اس کی بھی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہم پریم چند کے پیشے کے متعلق سوچتے ہیں کہ اگر وہ دلیل ہوتے تو کتنے کامیاب ہوتے۔ اس لیے نہیں کہ انھیں ساہوکارانہ گریادیں، بلکہ اس لیے کہ انھیں کسی چیز کے اثبات کے لیے دلائل اور براہین کی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی قوت استدلال کے جوہر جا بجا اگلے پڑتے ہیں۔ وہ نہایت آسانی سے بحث کرتے اور اپنی رائے کے استحکام کے لیے ثبوت پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ ورافسانہ کے لیے پریم چند نے اس میں غریبوں کی زندگی کے ساتھ امیروں کی زندگی کو بھی مدغم کر دیا ہے۔ یہ ان کی عادت سی ہے، کہ وہ اپنے افسانوں میں دونوں قسم کے کرداروں کو ساتھ ساتھ لے چلتے ہیں۔ نقائص اس میں بھی ہیں۔ ان کے کردار قصہ ہمیشہ اپنا رنگ بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتاب چونکہ خاصی طویل ہے اس لیے اکثر جگہ رکاوٹیں ہیں اور بندش میں جہتی باقی نہیں رہی۔

اب تک ہم نے پریم چند کی ان خدمات کا ذکر کیا ہے جو صرف ادب سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ ان کے ادب کا تعلق پوری طور پر ہماری زندگی ہمارے سراج اور ہمارے ملک سے ہے اس لیے وہ ادبی لیڈر کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے اپنے دور کے تمدن کی تاریخ ہیں، جو مستقبل پر بھی کہیں کہیں روشنی ڈالتے ہیں۔ پریم چند ادیب کی حیثیت سے اپنے فریضے سے عہدہ برآ ہوئے، اس کے علاوہ انھوں نے دیگر خدمات بھی انجام دی ہیں۔

پریم چند سوداگر ابتدائی دور میں رسالہ (زمانہ) میں ”رفقا زمانہ“ لکھ کر پریم چند نے ہمارے سیاسی شعور کو بیدار کیا اس سے ان کی سیاسی معلومات اور مدبرانہ قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کانگریس کی سرگرمیوں سے بھی متاثر ہوئے۔ ملازمت سے استعفا اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ ملازمت سے استعفا کے بعد انھوں نے ایک نئی زندگی شروع کی۔ انھیں اپنا اور اپنے اہل عیال کا پیٹ بھرنا تھا۔ اس لیے تجارت شروع کی لیکن ادیب صرف ادیب ہوتا ہے کاخذ اور قلم کا دھنی، اس کو ان تجارتی بکھیرطوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ تاجر کی فہمیت بھی

بلد شاہ کی سی ہوتی ہے اور، شاعر یا ادیب کی ابھی۔ یہ فقیر ہوتے ہیں لیکن دماغوں میں بادشاہت
بسی ہوتی ہوتی ہے اور کیوں نہ پردہ ہمارے دلوں پر چکرائی کرتے ہیں اور ہمارے خیالات کی برو
ان کے قبضہ اقتدار میں ہوتی ہے۔ اس طرح ایک انسانی دماغ میں دو بادشاہ، ادیب اور تاجر
ہیں سما سکتے۔ پریم چند کو بھی تجارت میں ناکامی ہوئی اور وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

دیو پریم چند تجارت کے بھٹیڑوں سے نجات حاصل کر کے انھوں نے ایڈیٹری شروع کی۔
مرجاد، مادھوری، ہنس اور جاگرنی سب ان کی ادارت میں نکلتے رہے اس میں تاجرانہ
ذہنیت کو رو بہ عمل لانا تھا اس لیے انتظامی قابلیت کے لحاظ سے تو وہ ناکام رہے لیکن
ادبیہ حیثیت سے ان رسالوں کا معیار بہت بلند کر دیا۔ اس سلسلے میں بھی انھیں سخت تلخ
تجربات اٹھانے پڑے۔ انھوں نے اپنے انسانوں، نادلوں، خطوط اور مضامین میں جگہ ایڈیٹر
اور ان کے فریض وغیرہ کے متعلق لکھا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ۔

”دیو پریم چند کے ایڈیٹر کو ذاتی رجحانات اور دوستانہ تعلقات سے بالاتر رہنا چاہیے۔“

اور اس قانون کے وہ پابند رہے۔ وہ ایڈیٹر کو قوم کا خادم اور ہی خواہ دیکھنا چاہتے تھے اور
اخبار کو ملک و ملت کا ترجمان۔ گویا ایڈیٹر اخبار ایک لیڈر ہے جو در پردہ قوم کے دلوں میں گھر
کرنا جاتا ہے اور قوم اس سے غائبانہ محبت کرنے لگتی ہے۔ لیکن یہ بات اسی وقت پیدا ہوتی ہے
جب کہ ایڈیٹر کا معیار بلند اور مقصد پاک اور بے لوث ہو۔ یہ پریم چند کے خیالات ہیں اور انھوں
ان پر چلنے کی ہمیشہ کوشش کی سب پرچوں سے انھوں نے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھایا۔ غرور
ہو گئے، اور فلم کمپنی کی ملازمت کو جو طوق گلو سے کم نہ تھی اس نقصان کی پابجائی کے لیے قبول کیا۔
پریم چند فلمی دنیا میں ان کا فلم کمپنی میں کام کرنا فلمی دنیا کے لیے تو فال نیک تھا لیکن خدا ان کیلئے
و بال جان تابہت ہوا۔ مالک فلم کمپنی اور ادا آموزوں کی نکتہ چینوں نے ان کی تصویر دنیا
کے خدا و حال کو مسخ کر دیا۔ جیسا پندرہ فلم بھی نہ بننے پائے تھے کہ پریم چند اس زندانی زندگی سے
ہنگام مگر بنا رہے چلے گئے۔ اگر وہ کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو شاید ان کے ڈراموں میں اضافہ ہو جاتا۔

پریم چند ڈرامہ نگاری کی حیثیت سے | ڈرامہ نگاری کی حیثیت سے پریم چند کا ادب میں کوئی مقام نہیں۔ بلکہ بہت کم لوگ واقف ہیں کہ انھوں نے دو تین ڈرامے بھی لکھے جہنمنا سانیٹوں کو دوسے ہوئے ڈراموں کے علاوہ ان کا ایک ڈرامہ جو کتابی صورت میں شایع ہو چکا ہے ”کر بلا“ ہے اس ڈرامہ کی شان نزول خود پریم چند کی زبانی سنیں۔

”میں نے حضرت حسینؑ کا حال پڑھا۔ ان سے عقیدت ہوئی ان کے ذوق شہادت نے مفتون کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ڈرامہ تھا۔۔۔۔۔۔ ڈرامے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قرأت کے لیے، ایک ایجنج کے لیے۔ یہ ڈرامہ محض پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ کھیلنے کے لیے نہیں۔“

زبان کے متعلق بھی پریم چند ہی کی تنقید سنئے۔

”میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مجھے لوگ زبردستی انشائے راز اور سحر نگار اور الم غلم لکھ دیا کرتے ہیں میں بات کو سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں۔ رنگ آمیزی انشائے راز سے میں قاصر ہوں۔“

یہ ایک خط کے اقتباسات ہیں جو پریم چند نے مدیر زمانہ کے نام ان کے چند سوالات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ”شب تار“ بھی ہے۔ افسانہ کی کتابوں میں بھی ایک دو مختصر ڈرامے ہیں لیکن چنداں قابل ذکر نہیں۔

معلم پریم چند | پریم چند کی زندگی تعلیمات کے محکمے سے شروع ہوئی۔ وہ بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے بچوں سے بڑوں کو اور مدرسہ کی ایک محدود جماعت سے نکل کر ہندوستانی قوم کو تعلیم دی۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے افسانوں اور ناولوں نے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر قدیم رسم و رواج ٹوٹ رہے ہیں۔ قید و بند کی

یہ پٹریاں کٹ رہی ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ انھیں ناولوں اور افسانوں کا اثر ہے یا انگریزی تعلیم
 فیشن اور راج کا یا ان دونوں کا۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ پریم چند نے اپنے موضوع سے
 ہندوستانی معاشرہ کے جمود کو توڑا، اور اپنی تقلید کرنے والے لوگ پیدا کیے۔ اس سے پتہ چلتا
 ہے کہ ان کے افسانوں نے بھی ہمارے سماج اور معاشرہ کے بندھنوں کو توڑنے میں ضرور
 ہاتھ بٹایا ہے۔ اور انسانی آزادی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح ہم پریم چند
 کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں متعلم، معلم، ناول نگار، افسانہ نگار اور فن کار مصلح قوم
 سمجھنے میں تامل نہیں کرتے۔

ساتواں باب - پریم چند کا اثر اردو افسانہ نگاروں پر

پریم چند کا موضوع ہندوستانی عوام تھے۔ انیسویں صدی کے ختم تک ہمیں ایسا کوئی افسانہ نگار نظر نہیں آتا جس نے براہ راست ہماری زندگی، ہمارے تمدن اور ہمارے معاشرے کے تار و پود کو اپنے افسانوں میں بکھیر کر رکھ دیا ہو۔ افسانہ کا وجود و عدم ہی مساوی تھا البتہ چند ایسے ناول نگار ضرور تھے جو ایک مخصوص طبقہ کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن ان کی یہ ترجمانی بھی عوام سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ پریم چند ہی اس میدان میں پہلے شخص نظر آتے ہیں جنہوں نے ہندوستانی عوام کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔

یہ دور انگریزی تعلیم کا تھا۔ لوگ انگریزی ادب پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس کوشش میں تھے کہ انھیں چیزوں کو یا تو اپنی زبان میں منتقل کیا جائے یا ایسا ہی ادب پیدا کیا جائے۔ گورکی، ترجینف، گولڈنچیف اور مپاسان کے پڑھنے والے تو تھے لیکن ایسا ادب پیدا کرنے کی کسی بڑے کوشش نہیں کی۔ البتہ کبھی کبھی ان کے ترجمے رسالوں میں نظر آنے لگے۔ پریم چند ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ادب برائے زندگی کی تعریف اپنے افسانوں میں شدت کے ساتھ ظاہر کی۔ وہ ادب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”ادب کی بہترین تعریف تنقیدیات ہے۔ چاہے وہ مذاہن کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہمارے حیات کا تبصرہ کرنا چاہئے۔“

وہ کہتے ہیں کہ۔

”ہمارا مذاق بڑی عیسیٰ سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب محض دل و بلاؤ کو چیر نہیں ہے۔ دل پہلا کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راک نہیں الایتا

”بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کے لیے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر نظر آتے ہیں۔“

اب اس نظریہ کی روشنی میں اگر ہم پریم چند کے کارناموں پر تنقید کریں تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے ادب کی جیسی تعریف کی، اس کے مطابق وہ لکھتے رہے اور سوسائٹی اور سماج کے وہ بدناما داع جو کلنگ کا ٹیکہ بنے ہوئے ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اپنے افسانوں کا پس منظر دیہات سے لیا اور کسان اور ان سے بازااست یا بالواسطہ تعلق رکھنے والے ان کے افسانے کا موضوع بن گئے۔

چونکہ نئی چیز کو دیکھنا اور اس کو حاصل کرنا یا اس کی نقل اتارنا انسانی جبلت ہے اس لیے بعض جدید افسانہ نگاروں نے اپنے آپ کو تخیلی حیثیت سے پریم چند کا شاگرد سمجھا۔ وہ ان کے ادب سے متاثر ہوئے اور ہر شخص نے بقدر ظرف پریم چند سے اقتساب فیض کیا کسی نے ان کے افسانے کے موضوع کا انتخاب کیا۔ کسی نے ان کے تخیلی انداز کا۔ کسی نے اسلوب بیان کو اڑانے کی کوشش کی، اور اکثر افسانہ نگاروں نے ان کی تقلید میں روس، فرانس، ترکی، امریکہ اور انگلستان کو چھوڑ کر ہندوستان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور اپنے افسانوں میں مقامی رنگ کو خاص جگہ دی۔

پریم چند کے مقلدین | سدرشن، اعظم کریدی، علی عباس حسینی، ایم اسلم، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، اور احمد ندیم قاسمی، پریم چند سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس طرح اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ موجودہ دور کے مشہور افسانہ نگاروں میں نصف سے

زیادہ کا تعلق پریم چند سے ہے۔ ان میں بعض افسانہ نگاروں نے پریم چند کے قومی جذبہ کی تفسیر کی اور اکثروں نے دیہات کو موضوع سخن بنایا۔

عظیم بیگ چغتائی | سدرشن اور عظیم بیگ مرحوم نے قومی جذبہ کو اکسایا۔ سدرشن نے تاریخی قصوں کو نیم تاریخی افسانوں کی حیثیت دی اور عظیم بیگ نے راجپوتوں کے عادات و اطوار۔ طریقہ بود و ماند اور ان کی آن بان اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں بیان کر کے اردو ادب میں پیش بہا اضافہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ ”سوان کی رو میں“ اور ناول ”جنگلی“ قابل مطالعہ ہیں۔

سدرشن | سدرشن کی زبان پریم چند کی طرح بہت سلیس ہے وہ تشبیہیں اور استعارے بھی لطیف اور مقامی استعمال کرتے ہیں وہ اپنے قصہ کا مواد صرف دیہات سے نہیں لیتے بلکہ کبھی کبھی شہر کے گلی کوچوں یا کارخانوں میں آجاتے ہیں۔ پریم چند کے کرداروں کی طرح سدرشن کے کردار بھی واقعت سے قریب ہوتے ہیں اور بالکل ہم میں کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ سدرشن نے ہمارے جذبات کو بہت زیادہ اکسایا ہے اس لیے ”مصور جذبات“ بن گئے۔ راجپوتوں کی عظمت کا اظہار ان کے بھی افسانوں سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ”عورت کی محبت“ اور ”محبت کا انتقام“ قابل مطالعہ ہیں۔ سدرشن نے افسانوں اور ڈراموں کی تقریباً پچیس سے زائد کتابیں شائع کیں اور اب تک کے تحفے معلوم ہوتے ہیں۔

اعظم کرپوی | اعظم کرپوی نے گذشتہ سال اپنے افسانوں کا مجموعہ (شیخ و برہمن) کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کو پیش نظر رکھ کر ہم انہیں پریم چند کا مقلد نہیں کہہ سکتے البتہ ان کی اردو کہتا ہیں ”پریم کی چوڑیاں“ اور ”گھڑول“ پریم چند کے اندازِ تحریر اور اسلوبِ بیان کی غمازی کرتی ہیں۔ وہ دیہات کے مناظر کا بڑی خوبی سے خاکہ کھینچے ہیں۔ دیہاتیوں کی تہذیب و تمدن کو نہایت اچھے پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور بالکل پریم چند کی طرح جزئیات و تفصیلات میں کھو جاتے ہیں اور اپنے ساتھ قاری کو بھی لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کے خیالات میں تنوع نہیں دوچار کہانیاں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اس کہانی کو پڑھ لیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ

غور و فکر کم کرتے ہیں اور ایک ہی حالت پر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کرپوی پریم چند کی تقلید تو کرتے ہیں لیکن پریم چند کے افسانے جس جوش و اثر کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں اس کا کرپوی کے ہاں نقدان ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ وہ ہندی کے شاعر ہیں اور ”ہندی شاعری“ کی تصنیف کے دوران میں اس زبان کا اثر ان کی زبان اور ادب پر کافی پڑ گیا ہے۔

علی عباس حسینی | ”رفیق تہائی“۔ ”آئی سی ایس“۔ ”بائی پھول“ اور ”کچھ ہنسی نہیں ہے“ کے مصنف دن بدن عروج پر ہیں۔ نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ سیرت نگاری اور کردار نگاری کی خصوصیات میں یکتگی آ رہی ہے اور ان کا بھی موضوع درہات ہے۔ وہ حقیقت نگاری کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ پریم چند بھی آخری دور میں حقیقت نگار ہو چلے تھے۔ کرداروں کی بھی یہ کیفیت ہے۔ وہ ہم میں سے ہیں اور کہیں باہر نہیں لیے گئے، اس لیے ہمیں زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ ان کی زبان پریم چند کی زبان کی طرح شیریں اور سبک ہے۔ اور انھیں الفاظ پر پورا قابو حاصل ہے۔ ابتداءً اکثر انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ پریم چند کی طرح اپنے افسانوں کا اختتام بھی بڑے شکوہ جملہ پر کریں۔ اب وہ شکوہ باقی نہیں رہا بلکہ سیدھے سادے طور پر جھستے ہوئے اور درود مند انداز میں افسانہ ختم ہوتا ہے۔ اب ان کے افسانوں میں ماہر نفسیہ کی باریک بینیوں داخل ہو رہی ہیں اور صنفی پہلو کا اثر بھی نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ اور ان چیزوں کی وجہ سے جاہلیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ایم اسلم | ایم اسلم کے بعض افسانے خاص طور پر مجموعہ ”کارزار حیات“ اور ”تفسیر حیات“ دیہاتی مناظر، دیہاتیوں کا کردار اور ان کے مصائب اور مشکلات اور ان کے باوجود ملیند اخلاقی اور نہان فواری وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ایم اسلم نے کہنے کو تو بہت کچھ لکھا، لیکن اگر اچھے افسانے جمع کیے جائیں تو مشکل سے ایک دو کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایم اسلم لکھے جانا چاہتے ہیں، خواہ کچھ ہو، اور کسی معیار کا ہو۔ ان کے معیاری افسانے

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت کی تلخ حقیقتوں کو انہوں نے ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ ایم اسلم زمیندار ہیں اور ان کی تحریر کے انداز میں بھی زمینداری کی بو آتی ہے۔ وہ رہتے شہر میں ہیں لیکن دورے کے واقعات لکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک ایک دو دو چیزوں کا اظہار کرتے ہیں جس سے افسانے میں جگمگ پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا انداز تحریر زیادہ تر ڈرامائی ہے ان کے اشخاص قصہ ہی اکثر واقعات بیان کرتے ہیں اور ان کے کرداروں پر دو شنی پڑتی ہے۔

کرشن چندر | کرشن چندر نے بھی حقیقت پسندی پر زور دیا ہے۔ ”ہوائی قلعے“ اور ”طلسم خیال“ سے زیادہ ”نظارے“ اس کے شاہد ہیں اپنا مطمح نظر واضح کرنے کے لیے انہوں نے ترقی پسند ادیبوں کے افسانوں کو ”نئے زاویے“ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ حال ہی میں ان کا ایک اچھا ناول ”شکست شایع ہوا ہے اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ بھڑکتے ہوئے پھیدگیوں میں رکھ کر سیدھا راستہ بھی بتلاتے ہیں۔ انھیں کاروباری زندگی پسند نہیں جس میں من و تو کے جھگڑے کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ پریم چند کا بھی یہی حال ہے۔ وہ شخصی فائدہ سے زیادہ قومی فائدہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کا ہیرو کبھی ذاتیات سے بھٹ نہیں کرتا۔ وہ حقیقت نگار زیادہ ہیں اور رومان نگار کم۔ لیکن کرشن نے ایک تدم آگے بڑھا کہ ان دونوں چیزوں کو اپنی تحریروں میں ملا کر دیا ہے۔ موجودہ سماج سے باغی ہیں۔

پریم چند کی طرح کہیں کہیں مزاحیہ رنگ بھی جھلکتا ہے وہ انسانی نفسیات کا بڑی گہری نظر مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خصوصیت میں وہ پریم چند کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ ان کے افسانے ”زندگی کے موڑ پر“ اور ”دو فرلانگ لمبی سڑک“ ہر لحاظ سے کامیاب ہیں اول الذکر بقول صلاح الدین احمد کے ”انسانی روح کی پکار کا ایک حیرت انگیز رکارڈ ہے جس میں آرٹسٹ نے سوز و غم کے نغمے تہقہوں اور مسکراہٹوں میں چھپا چھپا کر بھرے ہیں۔“

ادب و نعتہ اثبات۔ | کتاب اسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی فطرت انسانی کا دقیق نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور کرشن چندر سے زیادہ پریم چند سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے سماج کی ایسی تصویروں کو بے نقاب کیا ہے جو ہر کس ناکس کو نظر نہیں آتیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ”کونیل“ ”ڈاچی“ اور ”ستاروں کے کھیل“ شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی فن کاری کی بدولت بہت کم مدت میں محفل ادب میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی | بیدی بھی سماج کے بھیدی ہیں اور اسی لیے وہ باطنی ہیں ”دانہ و دام“ اور ”گرہن“ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے تجربات کو نئی اور موثر شکل میں پیش کرتے ہیں ان کے افسانے پنجاب کی زندگی کا عکس ہیں اس لیے وہ محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ زبان اتنی رواں، سلیس اور اچھی لکھتے ہیں کہ ان میں تصنع اور آدرد کا دخل نظر نہیں آتا۔

احمد ندیم قاسمی | ندیم بھی نو واردوں میں ہیں ”جو پال“ ”بگولے“ اور ”گرداب“ کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کا تعلق دیہاتی زندگی اور کسانوں کی دنیا کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ اس پر ان کی نظر کافی گہری ہے۔ اگر یہی رفتار رہے تو پریم چند کے بعد دیہاتی زندگی کے مصور بھی ہوں گے۔

ان تمام افسانہ نگاروں کے علاوہ دوسرے اور افسانہ نگاروں نے بھی سماج کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بہت کم تعداد ایسی ہے جو دیہات کے متعلق لکھتی ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر افسانہ نگاروں نے پریم چند سے فیض حاصل کیا ہے۔ سماج کے معمولی معمولی واقعات کو صغیر کاغذ پر لایا جا رہا ہے اور ان دور رس نتائج نکالے جا رہے ہیں اس سے ہندوستان کا بے حس معاشرہ بھی کرٹ لیتا نظر آتا ہے۔ دیہاتی اور سماجی زندگی کے رموز و نکات کو پریم چند نے بہت تفصیل کے ساتھ آشکارا کیا ہے۔ انکی کہانیوں میں کوئی تصنع اور نمود و نمائش نظر نہیں آتی۔ وہ جو کچھ دیکھتے تھے لکھ دیتے تھے ان کا مطالعہ زندگی اور مشاہدہ فطرت اتنا صحیح تھا کہ انھیں اس کے ثبوت کے لیے دلائل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کی شخصیت بھی نہایت شگفتہ تھی۔ ان کے افسانوں نے اردو افسانہ نگاری

کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ہندوستانی افسانہ نگاروں کے رجحانات میں کافی تبدیلی پیدا کی اور انہیں اپنے ماحول، اپنے وطن، اپنے سماج اور اپنی سوسائٹی کا مطالعہ کرنا سکھایا۔ اور مشاہدہ کو بیان کرنے کی طاقت عطا کی۔ اس سے نہ صرف ہمارے سماج کو فائدہ پہنچا بلکہ ملک بھی محسوس کی بندشوں سے آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ فقط

فہرست تصانیف منشی پریم چند

اردو افسانے

گیلانی الیکٹریک پریس لاہور	۵	افسانوں کی تعداد	۱- سوز و غم ڈیرویش
دارالاشاعت پنجاب لاہور	۱۲	" " "	۲- پریم چھپی حصہ اول
" " "	۱۳	" " "	۳- پریم چھپی حصہ دوم
" " "	۳۲	" " "	۴- پریم چھپی اول
" " "	۲۰	" " "	۵- پریم چھپی دوم
گیلانی الیکٹریک پریس لاہور	۲۰	" " "	۶- پریم چالیسی اول
" " "	۲۰	" " "	۷- پریم چالیسی دوم
" " "	۱۴	" " "	۸- خواب و خیال
" " "	۷	" " "	۹- خاک پر واد
انڈین پریس الہ آباد	۱۱	" " "	۱۰- فردوس خیال
عصمت بک ڈپو جلی	۹	" " "	۱۱- دودھ کی قیمت
حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۲	" " "	۱۲- زاو راہ
جامعہ طیبہ دہلی	۱۳	" " "	۱۳- واردات
لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور	۱۳	" " "	۱۴- سخبات
دارالاشاعت پنجاب لاہور		شایع شدہ افسانوں کا انتخاب	۱۵- دیہات کے افسانے

اردو ناول

ہندوستانی پریس کلکتہ	۱- ہم خزا و ہم خواب
زمانہ پریس کلکتہ	۲- روشنی رانی
انڈین پریس الہ آباد	۳- جلوہ ایشیا
دارالاشاعت پنجاب لاہور	۴- پانچارہن دو جلدوں میں
" " "	۵- ایک کان ہستی
" " "	۶- گوشہ عاقبت
لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور	۷- جلوہ حجاز

لاہیت رائے ایڈٹنس لاہور

سرسوتی پریس بنا سس
جامعہ ملیہ جھلی

دو جلدوں میں

- ۸ - نرملہ
- ۹ ✓ - فہن
- ۱۰ ✓ - بیوہ
- ۱۱ - میدان عمل
- ۱۲ ✓ - گنودان

ارو ڈرامے

زما سب پریس کانپور

عصمت بک ٹولڈو دہلی

ہندی افسانوں کی کہتاں

- ۴ - مان سرور دو جلدوں میں
- ۷ - کفن اور دوسرے افسانے
- ۸ - سپت سروج
- ۹ - پریم پھیبی
- ۱۰ - پریم پورشا
- ۱۱ - نو ندھی
- ۱۲ - پریم پرسوں
- ۱۳ - اگنی سادہ
- ۱۴ - سمر جاترا

- ۱ - شب تار
- ۲ ✓ - کر بلا
- ۳ - روحانی شادی

- ۱ - پریم دوشمی
- ۲ - پریم پرتما
- ۳ - پریم تیرتھ
- ۴ - پریرنا
- ۵ - پانچ پھولوں

ہندی ناول

- ۱ - بیواسدن
- ۲ - پریم آشرم
- ۳ - بردان
- ۴ - پریما (پرتگیا)
- ۵ - رنگ بھومی - دو جلدوں میں
- ۶ - فہن
- ۷ - کرم بھومی
- ۸ - نرملہ

- ۹ - کایا کلپ
- ۱۰ - گنودان
- ۱۱ - منگل سوتر

ہندی ڈرامے

- ۱ - کر بلا
- ۲ - سنگرام
- ۳ - جینکل کی کہانیاں
- ۴ - من مو دک
- ۵ - شیخ سعدی
- ۱ - بالکالوں کے درشن
- ۲ - رام چرچا
- ۳ - کتنے کی کہانی
- ۳ - پریم کی ویدی
- ۷ - درگاداس

بچوں کے لیے

ہندی ترجمے اور تالیفات

- ۱ - آ: اوکتھا (فسانہ آزاد کا خلاصہ)
- ۲ - چاندی کی ڈبیر
- ۳ - بڑتال
- ۴ - نیاسے
- ۵ - آہنکار - اناطول فرانس کے ڈرامے کا ترجمہ
- ۶ - سکھ داس
- ۷ - ٹالسٹائے کی کہانیاں
- ۸ - پتا کے پتر پتری کے نام
- ۹ - نیر شتی کا آرمہبہ (تخلیق کائنات)
- ۱۰ - گلپ سموچیر
- ۱۱ - گلپ رتن

عصمت چغتائی - ۲۲، ۲۰
 عظیم بیگ چغتائی - ۳۹، ۳۸
 ۹۹، ۹۸
 علم بحساب - ۱۹
 علی حسنین زیبا - ۱۰
 علی سردار جعفری - ۲۲
 علی عباس حسینی - ۳۹، ۳۷
 ۱۰۰، ۹۸، ۴۲

(ف)

فسانہ عجائب - ۳۵، ۳۴
 فضل حق قریشی - ۳۹
 فیاض محمود - ۲۲

(گ)

گاشی ناتھ جی - ۲۲
 گردار اور افسانہ - ۳
 کرشن چندر - ۳۲، ۳۱، ۹۸، ۱۰۱
 کلکتہ بیک آجینسی - ۲۷
 کلیات اقبال - ۳۰
 کتاب خوب آدمی تھا - ۱۲

(گ)

گائزوردی - ۲۸، ۲۹
 گاندھی - ۳۲، ۲۲، ۲۱
 گندگاپتنگ مال آفس - ۳۳، ۳۲
 گویند داس - ۲۳
 گوپال متل - ۲۲
 گورگی - ۳۵، ۳۴
 گوگول - ۹۷
 گیتا بھلی - ۷۷

(ل)

لاجپت رائے - ۱

مہری پت رائے - ۲۲، ۲۱
 سرسوتی - ۶۶، ۲۱
 سعادت حسن منٹو - ۳۲، ۳۱
 سلطان حیدر جوش - ۳۸
 سمپورن آنند - ۲۳
 سہیل - ۱۶
 سیندر کی رکھشا - ۲۶
 (ش)

شاہ لطیف - ۸۲، ۸۱
 شاہکار - ۱۶
 شبلی - ۱۰
 شکر جی دیاس - ۲۲
 شہپر شاد - ۲۳، ۲۲

شیرانی دیوی - ۲۳، ۲۶، ۲۷
 (ص، ط، ظ)

صغیر احمد جان - ۱۴، ۱۰
 صلاح الدین احمد - ۱۰۱، ۱۰۲
 طالب آبادی - ۸۳، ۸۹
 ظہیر الدین احمد طوی - ۱۳، ۱۲

(ع)

عالمگیر - ۱۶
 عبدالرشید ڈاکٹر بیگم - ۱۲
 عبدالحق - ڈاکٹر مولوی - ۶۹
 عبدالحلیم شرر - ۳۲، ۳۸، ۸۱، ۸۳

۸۵، ۷۶، ۷۷، ۷۹
 عبدالحمید - آغا - ۸
 عبدالرزاق راشد - ۳۰
 عبدالقادر سرودی - ۳
 عبدالماجد دیبادی - ۸۹
 عجائب لال - ۱۰

ڈاکٹرفکی - ۳۵
 ڈائٹے - ۳۵
 ڈکنز - ۲۸
 ذوا - ۲۸
 (س)

رابندر ناتھ ٹیگور - ۲۰، ۲۱، ۲۸، ۲۹
 ۷۷، ۷۶، ۷۷، ۷۸
 راجندر سنگھ بیدی - ۲۰، ۲۲، ۲۱، ۲۸
 - ۱۰۲

راشد انجیری - ۲۸، ۲۷، ۳۷ تا ۳۹، ۸۳
 رام بابو سکینندہ - ۷۷، ۷۸
 رتن ناتھ مرشار - ۳۶، ۳۷، ۷۹، ۷۷
 ۸۵، ۷۷

رچرڈ سن - ۱۸
 رسل - ۲۸
 رشید احمد صدیقی - ۳۷، ۳۸، ۸۳
 رشید جہاں - ۲۲، ۲۰
 رموزی - ۶۹
 روسی ادب - ۳۹

(ز)

زبان - ۷۷، ۷۶، ۲۱، ۲۸، ۳۸
 ۷۳، ۹۳، ۹۵

(س)

ساقی - ۷۶، ۲۵
 سب کس - ۱۶
 سجاد حسین - ۳۶
 سجاد حیدر - ۳۷، ۳۸
 سجاد ظہیر - ۲۱
 سریش - ۲۲، ۲۱، ۲۸، ۳۹، ۹۸
 ۹۶

نئی زندگی - ۱۶
 — (۹) —
 دانشنگار ارونگ - ۳۲
 والٹیر - ۳۵
 ورلڈ آف ٹھیٹر - ۸۹، ۲۸
 وشال بھارت - ۹
 وقار عظیم انبالوی - ۲ تا ۷

— (۱۰) —
 ہمارے افسانے - ۶، ۵
 ہٹایوں - ۱۶
 ہمدرد - ۲۱
 ہندوستانی ادب - ۱۶
 ہندوستانی اکیڈمی - ۲۷
 ہنس - ۹۲، ۲۲، ۲۳

— (۱۱) —
 یادگار پریم چند (زمانہ کا پریم چند)
 ۱۸۷۷، ۱۹، ۲۸ تا ۳۰
 ۹۵، ۸۹، ۸۲، ۷۰، ۶۲

ملک راج آنند - ۲۲
 منتر مفتی - ۲۲
 مویسان - ۹۷، ۳۵
 موی لال نہرو - ۱
 مہا پیر پرشاد - ۲۱
 میتھو آنرلڈ - ۱۶

— (۱۲) —
 ناز ہرے - ۲۶
 ناگری پرچارنی سبھا - ۲۷
 ندیم - ۱۶
 نذیر احمد - ۳۷، ۳۵، ۱۲
 نرائن سنگھ - ٹھاکر - ۱۹
 نگار - ۱۶

نفیسی - ۲۸
 نول کشورپرس - ۲۳
 نیا ادب - ۲۳، ۲۱، ۱۶
 نیا ادب کیا ہے - ۹۸، ۹۷، ۲۱
 نیا زنجیوری - ۶۹، ۲۸، ۲۷، ۲۵
 نئے ادبی رجحانات - ۱۲، ۱۱
 نئے زاویے - ۲۱، ۲۰

لارنس - ۳۲
 لائف آف شیخ - ۸۹، ۷۸
 لکشی، ۷۶
 لطیف الدین احمد - ۲۵، ۲۸
 — (۱۳) —
 مادھوری - ۹۲، ۲۲، ۲۳

مجلس - ۸
 مجنوں گورکھپوری - ۵۷، ۴۷، ۹، ۷، ۵
 محمد عسکری - مرزا - ۲۲، ۲۳، ۲۴
 محمد علی جوہر - ۲۷، ۲۱
 محمد علی حکیم - ۳۷
 محمد جمیل پروفیسر - ۳۹
 محی الدین زور، پروفیسر ڈاکٹر سید
 - ۶۹

مختصر تاریخ ادب اردو - ۱۰، ۱۱، ۱۲
 مرزا دوسا - ۲۸، ۱۳
 مرزا - ۹۲، ۲۲، ۲۳
 محاصرہ - ۱۶
 مقبول احمد پوری - ۸۳
 ملش - ۳۲

